ISSN:2394-7381

# ہماری آواز

## دبستان میرٹھ _ شاعری

یو جی سی کی کیئر لسٹ میں شامل جرنل
جولائی تا دسمبر 2022
مشترکہ شمارہ: 22-21
جنوری تا جون 2023

سرپرست اعلیٰ : پروفیسر سنگیتا شکلا (شیخ الجامعہ، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
سرپرست : پروفیسر وائی وملا (سابق نائب شیخ الجامعہ، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
پروفیسر نوین چند لوہنی (ڈین فیکلٹی آف آرٹس، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
مدیر اعلیٰ : پروفیسر اسلم جمشید پوری (صدر، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
مدیرہ : ڈاکٹر شاداب علیم (شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
نگراں : ڈاکٹر آصف علی (شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
مشیر : ڈاکٹر ارشاد سیانوی (شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
ایڈیٹوریل بورڈ : فرح ناز (ریسرچ اسکالر)، گلناز، (ریسرچ اسکالر) شاہِ زمن (ریسرچ اسکالر)
عظمیٰ پروین (ایم۔اے سال دوم)، دل کش (ایم۔اے سال دوم)، فاروق شیروانی (ایم۔اے سال دوم)
کمپوزنگ : سعید احمد سہارنپوری (سی، سی، ایس، یونیورسٹی، میرٹھ)، محمد شمشاد (سی سی ایس یو)
قانونی مشیر : پروفیسر انجلی متل (ڈین فیکلٹی آف لا، سی، سی، ایس، یو، میرٹھ) ڈاکٹر محمد شعیب (ایڈووکیٹ)
مجلس ماہرین : EXPERT PANNEL
☆ محترم عارف نقوی (جرمنی) ☆ پروفیسر قدوس جاوید (کشمیر یونیورسٹی)
☆ پروفیسر یوسف عامر (سابق وائس چانسلر جامعہ ازہر، مصر) ☆ پروفیسر ارتضیٰ کریم (ڈین فیکلٹی آف آرٹس، ڈی یو)
☆ پروفیسر محمد غلام ربانی (ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش) ☆ پروفیسر انور پاشا (جے۔این۔یو، نئی دہلی)
☆ پروفیسر شبنم حمید (الہ آباد یونیورسٹی) ☆ پروفیسر کوثر مظہری (جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)

قیمت: خاص شمارہ: -/600 Rs. مجلد: -/650 بیرونی ممالک 10 امریکی ڈالر 20 سعودی ریال
ناشر : پروفیسر اسلم جمشید پوری

شعبۂ اردو : چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ
URL: http://ccsuniversity.ac.in/ccsu/adminSdept/
duccsumrt@gmail.com, aslamjamshedpuri@gmail.com,
muhammadshamshadinfo@gmail.com
09456259850, 9759238472 , 9639987872, 9520500843

Scanned with CamScanner

پروفیسر عابد حسین حیدری

# اردو مرثیہ اور میرٹھ

راجدھانی دہلی کے قریب اتر پردیش کا قدیم شہر میرٹھ اور اس کے گردونواح کا خطہ اردو شعروادب کے حوالے سے کافی زرخیز رہا ہے۔ یہاں ہر دور میں ادبا وشعرا پیدا ہوتے رہے اور شعروسخن کا ہر زمانے میں چرچا ہوتا رہا ہے۔ صہبائی، فرقانی، اسمٰعیل میرٹھی، رنج میرٹھی، قلق میرٹھی دہلی کی آخری بہار کے روشن منارے بن کر میرٹھ کا نام روشن کرتے رہے اور دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کے اساتذہ کے درمیان اپنی علمیت اور ادبی حیثیت کو تسلیم کرا کر میرٹھ کا نام ادبی تاریخ میں ثبت کررہے تھے۔ دبستان میرٹھ کے سخنوروں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جنھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ تحقیق وتنقید، صحافت، لسانیات اور انشاپردازی کے ساتھ ساتھ فکشن میں بھی اپنی انفرادیت کو تسلیم کرایا ہے۔ یہ سرزمین جہاں اپنی سرسبزی وشادابی سے لوگوں کو مسخر کرتی ہے وہیں سخنوران میرٹھ نے اپنے کمال وصفات اور سخن دانی سے دنیائے ادب میں میرٹھ کا نام روشن کیا ہے۔ شاعری کی جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے والے شعرا کی ایک طویل فہرست ہے، جن کے کمالات فن پر میرٹھ اور نواح میرٹھ کے ادب نوازوں کو فخر حاصل رہا ہے۔

میرٹھ کے شعروادبا نے جہاں غزل، مثنوی، نظم، قصیدہ، قطعہ، رباعی، واسوخت، نعت ومنقبت میں معتد بہ سرمایہ چھوڑا ہے وہیں رثائی ادب کی اصناف مرثیہ، سلام، نوحہ وغیرہ میں اپنی انفرادی شناخت قائم کی ہے اور اس خطے کے رثائی ادب کا ذخیرہ بھی اس علاقے کو مفتخر کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہاں بولی جانے والی کھڑی بولی کا اردو زبان وادب کی تشکیل میں کلیدی کردار رہا ہے۔ دہلی سے قریب ہونے کے سبب میرٹھ ہمیشہ سیاست کی آماجگاہ رہا اور سیاسی رسہ کشی نے میرٹھ کو اکثر متاثر رکھا، عہد مغلیہ کے سیاسی تغیرات نے میرٹھ کے تہذیب

Scanned with CamScanner

ومعاشرت اور سیاست و ثقافت پر گہرا اثر ڈالا۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بدلے ہوئے حالات نے دہلی ولکھنؤ سے بہت سے شعراوادبا کو میرٹھ ہجرت کرنے پر مجبور کیا جس کے نتیجے میں میرٹھ میں علم وادب کی محفلیں آراستہ ہونے لگیں اور شعروسخن کا بازار گرم ہوااور زبان و ادب کی خوب ترقی ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کے حالات نے جہاں اردو کی دیگر اصناف شاعری میں تبدیلی کے در وا کیے ہیں، وہیں رثائی شاعری خصوصاً مرثیہ میں بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ مرثیہ کے تہذیبی پس منظر میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ مرزا دبیر اور میر انیس اور ان کے معاصرین کے دور میں توضیحی اور بیانیہ شاعری کی ضرب المثل اور لازوال تصویریں موجود ہیں، رزمیہ بیانات، اخلاقیات، جذبات ونفسیات کی فطری پیشکش، مناظر کی تصویر کشی اور تخئیل کاری میں ندرت ونزاکت عروج پر ہے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد سماجی عوامل، آداب واطوار، تہذیب وتمدن اور بول چال میں روزمرہ اور محاوروں کی آمیزش، جزئیات کے بیان میں محاکاتی انداز اور قوت اظہار کے دوسرے شعبوں میں تبدیلی کا احساس ہونے لگا تھا۔ انیس جیسے قادرالکلام شاعر کو بھی اس کا احساس تھا:

اجڑ گیا نہ فقط لکھنؤ کا اک طبقہ
انیس ملک سخن میں بھی انقلاب آیا

اور دبیر جیسے صاحب نظر مرثیہ گو کو بھی ملک سخن میں تبدیلی پر حیرت واستعجاب ہو رہا ہے:

اگلا سا وہ مجمع ہے نہ اگلے سے وہ لوگ
یاں آن کے حیرت میں دبیر آیا ہے

۱۸۵۷ء کے سانحہ کے بعد معاشی اور سماجی انتشار ہندوستان کا مقدر بن گیا تھا۔ ۱۸۸۳ء میں مولانا الطاف حسین حالی نے ''منظرۂ واعظ وشاعر'' لکھ کر اس عہد کی ادبی فضا میں انتشار کا کما حقہ محاکمہ کیا ہے۔ شاعر واعظ سے کہہ رہا ہے:

قبلہ اب وہ دن گئے جب شاعروں کی قدر تھی
شاعری اور نکتہ پردازوں میں اب ہے کیا دھرا

ظاہر ہے ان حالات سے مرثیے کی فضا بھی شدید طور پر متاثر ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے مرثیہ نگاروں کے مرثیوں میں سوز وگداز کی بہت فراوانی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی غزلوں میں بھی یہ سوز ہے۔ واجد علی شاہ اختر کے مرثیے میں بھی اسی درد کی لہر نظر آتی ہے:

خدا کرے کہ کسی کا جدا حبیب نہ ہو — یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو
کبھی زمانہ درد و الم قریب نہ ہو — غضب ہے ہو مرض ہجر اور طبیب نہ ہو
غبار باد کو درکار آب باراں ہے

Scanned with CamScanner

دبستان میرٹھ

دوا مریض کو دید بہار بستاں ہے ۲

یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب یا اس کے بعد کی مرثیہ نگاری اپنے موضوع کی وسعت کے اعتبار سے کسی خاص فرقہ یا قوم کی شاعری نہیں رہ گئی تھی بلکہ عالم انسانیت کی شاعری بن گئی تھی۔ طاہر حسین کاظمی نے لکھا ہے کہ:

''ان شعرا نے فکر واحساس، تجربات او رمشاہدات کو فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ مرثیہ اخلاقیات کے ساتھ ساتھ ادبی حیثیت سے عام انسانی زندگی کے قریب اور آفاقی اقدار کی ترجمانی کا ایک اہم ذریعہ بن گیا۔'' ۳

شمالی ہند میں عزاداری کے فروغ کے بعد یہاں مرثیہ نگاری کا رجحان بڑھا اور جگہ جگہ مجلسوں میں مرثیہ خوانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے لکھا ہے کہ:

''جب عزاداری عوامی نوعیت اختیار کرنے لگی، گھر گھر مجلسیں منعقد ہونے لگیں تو ایسے مرثیوں اور ایسی کتابوں کی ضرورت ہوئی جنھیں عوام مجلسوں میں پڑھ سکیں۔ بازاروں اور گھروں میں فارسی کی جگہ اردو لے چکی تھی۔ اس لیے روضۃ الشہداء کے بجائے ایسی کتاب کی ضرورت محسوس ہوئی جسے عوام سمجھ سکیں اور فضلی کی کربل کتھا وجود میں آئی۔'' ۴

فضلی کی کربل کتھا شمالی ہند کی ادبی تاریخ کی ایسی دستاویز ہے جس میں میرٹھ اور اس کے اطراف کی زبان محسوس کی جاسکتی ہے۔ فضلی کے بارے میں حتمی طور پر یہ تو نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اصلاً کہاں کے رہنے والے تھے لیکن مسعود حسن رضوی ادیب کی تحقیق کے مطابق مشہور مرثیہ گو کرم علی کے بھائی تھے، سیکڑوں مرثیے کرم علی کے مشہور ہیں۔ کربل کتھا کے تعلق سے مسیح الزماں نے جو اطلاع بہم پہنچائی ہے اس کے مطابق ''کربل کتھا ۵'' ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء میں لکھی گئی۔ اس میں بارہ مجلسیں ہیں جو فارسی کی مشہور ومقبول کتاب ''روضۃ الشہدا'' کو سامنے رکھ کر آسان اردو میں لکھی گئیں تا کہ جو لوگ مجلسوں میں فارسی نہ جاننے کی وجہ سے ''روضۃ الشہدا'' کو سمجھ نہیں سکتے وہ بھی کربل کتھا کی صورت میں اسے سن کر واقعات شہادت سے اثر لے سکیں۔ اس سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت مجلسوں میں عموماً ''روضۃ الشہدا'' کے پڑھنے کا رواج تھا جسے روضہ خوانی کہتے تھے۔ یہ بات تاریخی شواہد بتاتے

Scanned with CamScanner

ہیں کہ اورنگ زیب کے زمانے میں بھی متعدد امرا کے یہاں بالا علان تعزیے داری ہوتی تھی۔ بہادر شاہ اول اور فرخ سیر کے زمانہ سے قلعہ معلیٰ کے اندر بہت سے شہزادے اور بیگمات شاہی تعزیہ داری کرنے لگی تھی۔ مسکیںؔ کے مرثیوں کے اقتباسات ''کربل کتھا'' میں موجود ہیں جو اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ وہ مشہور ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ دہلی میں ''کربل کتھا'' کی مجالس عزا میں موجودگی نواح دہلی کے شہر میرٹھ میں بھی پڑی ہوگی اور یہاں کی عزائی تہذیب میں بھی کربل کتھا مجلسوں میں رائج ہو چکی تھی۔

علی جواد زیدی اور مسیح الزماں نے ''کربل کتھا'' کو مثنوی کی ہیئت میں شمار کیا ہے لیکن مسیح الزماں اس بات کو بھی واضح کرتے ہیں کہ فضلی نے اپنے مرثیوں کے بہت سے حصے اس میں داخل کیے ہیں، جو مربع اور مفردہ ہیں۔ مسیح الزماں نے اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں، حضرت علی اکبر میدان جنگ میں ہیں اور ماں کی حالت فضلی نے یوں دکھائی ہے:

آنکھوں سے آنسو چلے جاتے تھے زار — پھرتی تھی خیموں میں روتی بے قرار
جھانکے تھی دروازے پر جا بار بار — کہتی تھی اس در پہ بھی کوئی دربان ہے

☆

جو مجھ اکبر کی خبر لادے شتاب — یعنی کوفیوں پر ہوا وہ فتح یاب
اس کو دوزرزیور اپنا بے حساب — منھ بھروں شیرینی سے ارمان ہے

☆

اے مبارک در اگر تجھ میں سے پھیر — جیوتا آوے مرا اکبر سا شیر
تجھ کو دوں صندل کے چھاپے ہو دلیر — دل مرا یہ آرزو خواہان ہے

☆

ڈاکٹر مسیح الزماں درج بالا اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مامتا کی کیسی دل کش تصویر ہے۔ فضلی نے جناب شہر بانو کے ان جذبات کا بیان لکھ کر مرثیے کو ایک نئی سمت دی ہے۔ اس جذبات نگاری میں ایسی تازگی ہے جو اس عہد کے مرثیوں میں نہیں ملتی۔ حضرت علی اصغر کے حال میں تو جا بجا ماں کی مامتا کا ذکر آتا ہے، لیکن حضرت علی اکبر کے لیے اس حالت کا بیان فضلی کی جدت ہے۔''[۶]

Scanned with CamScanner

فضل علی فضلی کو ذکر حسین اور مرثیہ نویسی کے متعلق یہ گلہ رہا کہ لکھنے والوں نے دقیق زبان کو زیادہ برتا ہے۔ فارسی آمیز اسلوب کی وجہ سے مجلس کو عام اور کم پڑھے لوگ اس واقعہ کو پوری طرح نہیں سمجھ پاتے۔ ''روضۃ الشہداء'' کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے یہ بات بہت وضاحت کے ساتھ لکھی ہے۔ گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون ''کربل کتھا کا لسانی تجزیہ'' میں فضلی کے اس طرز فکر کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''کربل کتھا کی لسانی اہمیت اس لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کا روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جو فارسی عربی سے نابلد تھے۔ قدیم زمانے میں زبان کا معیار صرف 'منتخب روزگار' یعنی خاص طبقے کے افراد ہی متعین کیا کرتے تھے جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آج اردو کو عوامی رشتوں کا سراغ لگانے میں طرح طرح کی دقتیں پیش آتی ہیں۔ مقام شکر ہے کہ کربل کتھا کی زبان ان مصنوعی بندشوں سے بے نیاز رہی اور اس میں بوجوہ روزمرہ عوام ہی کو اختیار کیا گیا۔''[۷]

ڈاکٹر ہلال نقوی نے ''کربل کتھا'' کی لسانی اہمیت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''روضۃ الشہداء'' جو فارسی زبان میں تھی، اسے فضلی نے جن لسانی بنیادوں پر اردو نثر کے سانچے میں ڈھالا وہ اس بات کا غماز ہے کہ اس وقت عوام میں واقعۂ کربلا کو جاننے کی جو تڑپ تھی وہ انھیں رنگینیٔ عبارت اور حسن استعارات کے بجائے سیدھی سادھی بے تکلف زبان کا گرویدہ کر رہی تھی۔ فضلی کے نزدیک اس کا بڑا مقصد یہی تھا کہ ہر ایک بے خبر اس درد پرسوز اور خبر اندوہ کو سن کر اور سمجھ کر روئے۔''[۸]

ہلال نقوی نے فضلی کے مربع مرثیے کے تین بند بھی نقل کیے ہیں، جو مسعود حسن رضوی ادیب کے کتب خانے میں تھا اور جسے اپنے مضمون ''مرثیہ امام مظلوم من کلام فضلی'' میں مالک رام نے نقل کیا ہے:

کربلا میں کیا پڑا گھمسان ہے　　عابدیں جس دکھ سیتی گریان ہے
فاطمہؑ کا جان یو بے جان ہے　　آج کی شب کا دیکھو مہمان ہے

☆

فاطمہؑ جنت میں سن کر یو حوال ڈال کفنی کھول کر سب سر کے بال
جا پیمبرؐ سے کہا رو اس مثال آج میرا طفل بے درمان ہے

☆

رو سکینہ دکھ سے کرتی یو بیاں اے حسینؑ امت کے ہادی بیکساں
چھوڑ کر مجھ کو گیا تو اب کہاں کربلا کا کیا بلا میدان ہے

ہلال نقوی نے مندرجہ بلا مرثیے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''فضلی کا یہ مرثیہ عوام کے لیے رونے رلانے کا ایک ذریعہ تو بن سکتا ہے مگر ادبی سطح پر اس کا معیار پست ہے۔ فضلی کے مقابلے ان کے چھوٹے بھائی کرم علی کے مرثیے زیادہ پرکشش ہیں۔'' یہاں پر انھوں نے کرم علی کے مرثیے کے تین بند نقل کیے ہیں، جن میں سے ایک بند بطور مثال نقل کیا جا رہا ہے:

حسینؑ ابن علیؑ رہنمائے راہ نجات سرور جان پیمبرؐ شہ ستودہ صفات
سو اس کے ظلم ستی مل کے شامی بدذات کیے شہید ہزاروں جفا سیتی ہیہات

ہلال نقوی کی اطلاع کے مطابق مسعود حسن رضوی ادیب کے کتب خانے میں کرم علیؑ کا ایک سو بارہ مرثیے تھے۔ انھوں نے فضلی اور کرم علی کے مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''گویا یہ ایک طرح موضوعاتی مرثیے کے وہ دھندلے نقوش ہیں جو بعد میں اپنی ارتقائی منزل پر تسلسل واقعات کربلا کی مختلف کڑیاں بن جاتے ہیں۔ یہاں پر فضلی کا ضمناً تذکرہ کیا گیا ہے لیکن آگے میرٹھ کے ان شعرا کا ذکر کیا جا رہا ہے جنھوں نے میرٹھ کے ادبی افق پر نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔

سید احمد حسن فرقانی وشاکی/ باکی:

فرقانی میرٹھ کے ان شعرا میں سے ایک تھے جنھوں نے دہلی اور لکھنؤ میں میرٹھ کی ادبی حیثیت کو تسلیم کرایا۔ وہ اس عہد میں پیدا ہوئے جب اردو شاعری شباب پر تھی، دلی میں مومن، غالب اور ذوق کا اور لکھنؤ میں ناسخ و آتش کے ساتھ انیس و دبیر کا طوطی بول رہا تھا۔ دونوں ہی جگہ سلطنتیں مٹ رہی تھیں لیکن اردو شاعری پھل پھول رہی تھی۔ دلی اور لکھنؤ ہی نہیں بلکہ چھوٹے شہروں اور بڑے قصبوں میں بھی شعر و شاعری کی محفلیں جم رہی تھیں اور شعرا کی کثیر تعداد اردو شعر و ادب کا گیسو سنوارنے میں لگی تھی۔ بہت سے اہم شعرا تاریخ ادب کے اوراق سے گم ہیں لیکن فرقانی کئی وجہوں سے نہ تو گم ہوئے نہ جدت کے چکر میں بگڑنے پائے

اس کا سبب یہ تھا کہ وہ بہت ہی وسیع مطالعہ کی حامل شخصیت تھے۔ وہ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے لیکن وہ اردو شعرا کی کمیت اور کیفیت سے پوری طرح واقف تھے۔ غرض ہندوستان کے فارسی گو شعرائے متاخرین میں سید احمد حسن فرقانی نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور وہ سینتالیس برس کی عمر میں ہی انتقال کر گئے۔ علی جواد زیدی فرقانی کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

''ان کے فارسی کلام بالخصوص قصائد کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ کچھ دنوں اور زندہ رہ گئے ہوئے تو شاید زمانہ انھیں اس آسانی سے بھول نہ پاتا۔ ان کے فارسی مکتوبات، ان کا اردو دیوان اور مذہبی کلام بھی سراسر ناقابل اعتنا نہ تھا بلکہ اپنے زمانے میں انھوں نے نام بھی کمایا اور ارباب نظر سے داد بھی لی۔''۹

فرقانی جو (اردو ادب میں شاکی اور مذہبی کلام میں باکی تخلص کرتے تھے) کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ وہ غالب، میر انیس، مرزا دبیر، عبدالحلیم شرر اور مفتی محمد عباس کے ہم عصر اور ان شعراء وادبا کے قریب رہے ہیں اور ان کے ارتباط کی داستانیں کلیات فرقانی کی بہ دولت ہی باقی رہ گئی ہیں۔ علی جواد زیدی کی اطلاع کے مطابق فرقانی ۱۸۳۶ء مطابق ۱۲۵۱ھ میں بمقام میرٹھ پیدا ہوئے اور ۱۴ ستمبر ۱۸۸۳ء بروز آدینہ صبح کے وقت میرٹھ میں وفات پائی۔ فرقانی میرٹھ کے سادات گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد منشی سید کفایت علی تنہا وراشد ابن سید الٰہی بخش عرف میر مینڈھو ہیں۔ میر مینڈھو کا سلسلہ نسب امام علی رضا علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ شرفا کا یہ خاندان علم وادب کا دلدادہ تھا اور اس میں کئی اصحاب وابستۂ سرکار اور رئیس تھے۔ علی جواد زیدی نے فرقانی کے بیٹے روحانی کا قول نقل کیا ہے کہ: ''وہ (فرقانی) فطرتاً ذکی وذہین وطباع و ہوشمند پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے جملہ علوم متداولہ کو برگزیدہ صحبتوں اور مسلسل اور کثیر مطالعہ کتب سے کما حقہ حاصل کیا تھا۔ معنی و بیان ولغت وعروض وقافیہ وصنائع وبدایع جملہ علوم ادب پر محیط تھے۔'' فرقانی بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ مقدمہ کلیات فرقانی میں سید مہدی علی نے لکھا ہے کہ:

''سات برس کے سن میں اچھا خاصا شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ کسی کو بھی اپنا شعر بہ نظر اصلاح نہیں دکھایا۔'' لیکن سید علی احمد دانش نے اپنے مضمون ''میر انیس نادر معلومات'' میں میر

Scanned with CamScanner

انیس تدفین کی سرخی کے تحت جہاں میرانیس کی تدفین کی تفصیل لکھی ہے وہیں فرقانی کو مرزا دبیر کا شاگرد لکھتے ہوئے ان کے مرثیے کا ایک بند بھی نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرانیس کی تدفین: میرانیس نے ۱۰؍دسمبر ۱۸۷۴ء مطابق ۲۷؍شوال ۱۲۹۱ھ کو بوقت عصر انتقال فرمایا۔ خبر پھیلتے ہی عقیدت مندان انیس جمع ہونا شروع ہو گئے جن میں علماء، حکما، شعرا، مختلف صنعت وحرفت سے وابستہ اکابرین تھے..... بڑا دردناک منظر تھا۔ ہائے میر صاحب، ہائے میر صاحب کی صدائیں فضا کو غم انگیز بنائے ہوئے تھیں۔ پڑوس کے گھروں سے بھی مستورات کے گریہ کی ہلکی ہلکی صدائیں آرہی تھیں، جو اس ماحول میں تازیانہ کا کام انجام دے رہی تھیں، مرزا دبیر کے شاگرد احمد حسن فرقانی میرٹھی اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک مسدس میں اس ساری کیفیت کا ذکر کیا ہے۔ یہ مسدس دبیر اور انیس کے سلسلہ میں اہمیت کا حامل ہے۔ صرف ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

اکیانوے بارہ سو یہ جو سال آیا ناگہاں تاریخ بست و ہفتم شوال تھی عیاں
افسوس ناپسند ہوا مسکن جہاں ہستی سے میرانیس عدم کو ہوئے رواں
ہر دل کو داغ لالہ کے مانند دے گئے
باغ جہاں سے خلد کو تشریف لے گئے [۱۰]

جبکہ علی جواد زیدی کا خیال ہے کہ ''نہ تو فرقانی خود کسی کے شاگرد تھے اور نہ کبھی کسی اور کو باقاعدہ شاگرد بنایا۔'' انھوں نے لکھا ہے کہ فرقانی کو اپنے کلام پر نہیں فارسی کلام پر ناز تھا لیکن اردو میں سلام گوئی سے ابتدا ہوئی اور مرزا مغل شاگرد دبیر نے جب مرزا دبیر کا یہ سلام پڑھا، جس کا مطلع ہے:

مجرئی ہے سوگوار ماہ حیدر چاندنی
اشک ہیں شبنم، بکا کرتی ہے شب بھر چاندنی

تو فرقانی نے اسی زمین میں سلام کہا جس کا مطلع تھا:

شہ کے جسم پاک پر تھی جلوہ گستر چاندنی

Scanned with CamScanner

مجرئی کیا نور تھا، تھی چاندنی پر چاندنی

سے اردو کلام کی ابتدا ہوتی ہے۔ پھر کچھ اور احباب نے بھی اصرار کیا کہ چند سلام اور کہے جائیں۔ لیکن انھوں نے عذر کیا کہ میں اردو میں کہتا نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ''مرثیہ و سلام کے مرحلے کا طے کرنا کہ اردو کے تمام انواع کلام سے دشوار تر ہے، ممکن نہ ہو سکے گا''۔ لیکن وہ لوگ نہ مانے اور ان کا دل رکھنے کے لیے چند سلام جمع کر لیے۔ بعد میں کچھ اور سلام بھی یکجا کیے اور اس کے لیے بھی فرقانی نے ایک دیباچہ لکھا تھا، لیکن یہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ یہ سب اور ان کے علاوہ کچھ اور سلام شامل کر کے روحانی نے ''سخن باکی'' کے نام سلاموں کا مجموعہ بھی شریک کلیات کر لیا ہے۔

علی جواد زیدی نے لکھا ہے کہ اردو غزلوں کے دیوان شاکی کے علاوہ انھوں نے جو مدحیہ اور رثائی کلام اردو میں لکھا ہے اس میں باکی تخلص اختیار کیا ہے۔ اس قسم کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ انھوں نے ''دار السلام فی مآثر الامام علیہ السلام'' کے نام سے ۱۲۷۹ھ میں مطبع نول کشور سے شائع کرایا تھا۔ ان کے دوسرے فارسی دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۲۸۵ھ کے بعد کچھ اضافے کیے اور مزید اضافوں کے ساتھ سخن باکی کے نام سے شائع کیا۔ علی جواد زیدی کے مطابق ''اس میں کل ۴۴ سلام اور پانچ مخمس ہیں۔ نو سلام اور دو مخمس مطبوعہ نسخہ دار السلام کے ہیں، باقی بعد کے لکھے ہوئے ہیں، باقی دو سلام ع

مصائب کے لکھنے کا یارا نہیں

اور ع

اے کلک عزا صفحۂ ماتم پہ رواں ہو

کے بارے میں یہ قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ فرقانی ہی کے ہیں۔ سلام و مخمس کے علاوہ ۹۷ رباعیاں توحید و نعت و منقبت اور دیگر مروجہ مضامین پر مشتمل ہیں۔''

فرقانی کی علمیت کا اعتراف غالب، دبیر اور مفتی محمد عباس کے علاوہ عبد الحلیم شرر نے کیا ہے۔ ان کے انتقال پر بہت سے صاحبان علم و ادب نے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ عبد الحلیم شرر نے قطعۂ تاریخ وفات میں حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:

آں افصح جہاں و بلیغ زمان او
احمد حسن کہ بود فصاحت فدائے او

بہر حال فرقانی اپنے عہد میں، کم سنی کے باوجود، بزرگ شاعروں، مسلم ادیبوں اور ہم

Scanned with CamScanner

عصروں میں مقبول و ممدوح تھے اور لوگ ان کی علمیت و اہمیت کے قائل تھے۔ اس حیثیت سے اتنی علمی شخصیت کا سلام اور مخمس میرٹھ کے رثائی ادب کی مبسوط روایت کی ضمانت ہے۔ فرقانی کے بعد میرٹھ کے جس شاعر نے رثائی ادب کو اعتبار بخشا وہ بیان میرٹھی ہیں۔

**بیانؔ میرٹھی:**

سید محمد مرتضیٰ بیانؔ میرٹھی، میرٹھ کا ایسا شاعر ہے جسے شعر و ادب کی تاریخ میں وہ مقام نہیں ملا، جس کے وہ مستحق تھے۔ فن پر مکمل عبور رکھنے والا میرٹھ کا یہ عظیم فرزند بروقت ناقدین و محققین کی توجہ کا مرکز نہ بن سکا اور اردو تحقیق و تنقید ایک مستحق فنکار کو تاریخ میں جگہ نہ دے سکی۔ جبکہ بیانؔ اصناف شاعری کے جملہ لوازم کے ساتھ نعت، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، غزل اور نظم کہنے پر حاوی تھے۔ ان کا کلام شائع تو ہوا لیکن میرٹھ سے باہر کے اکابرین ادب خصوصاً دہلی اور لکھنؤ کے ادبا و شعرا تک نہ پہنچ سکا اور بیانؔ گمنانی کا شکار ہو گئے۔

بیانؔ کے آبا و اجداد جارچہ ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ والد سید گوہر علی ابن سید کرامت علی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے زمانے میں سید گوہر علی کے خاندان پر سات انگریزوں کے قتل کا الزام تھا۔ قندیل حرم[۱۱] میں ڈاکٹر سید صفدر حسین نے لکھا ہے کہ ''اس مصیبت سے بچنے کے لیے انھوں نے اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر میرٹھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔'' اردو میں بیانؔ اور فارسی میں یزدانی تخلص کرتے تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت امام رضا سے ملتا ہے۔ ان کی پیدائش ان کے نانا کے یہاں ہوئی تھی، جو اس وقت جھانسی (بندیل کھنڈ) میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے فائز تھے لیکن بعد کو انھوں نے میرٹھ میں نشو و نما پائی اور زندگی کا بڑا حصہ بھی اسی شہر میں گزرا، اسی لیے میرٹھی کہلائے۔

محمد شرف الدین ساحل[۱۲] کی تحقیق کے مطابق صحیح تاریخ ولادت معلوم نہ ہو سکی لیکن مخزنۂ جاوید کی اطلاع کے مطابق ''ساٹھ سال کی عمر کے قریب ۱۹۰۰ء میں بمقام میرٹھ انتقال کیا۔'' شاعری کی ابتدا کے تعلق سے ساحل لکھتے ہیں:

> ''بیانؔ کو شاعری کا شوق ابتدائے سن شعور ہی میں ہو گیا تھا۔ مزاج بھی شاعرانہ تھا، لہٰذا کتب درسیہ کی تکمیل کے بعد کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیے بغیر کہنا شروع کیا۔ البتہ آگے چل کر سید احمد حسن فرقانی میرٹھی نے ان کے ذوق شعری کو تقویت پہنچائی اور مفید مشوروں سے نوازا۔''

Scanned with CamScanner

بیانؔ جب جوان تھے، سرسید تحریک زوروں پر تھی، بیانؔ بھی سرسید کے ہم نوا بنے اورانھوں نے ہرطرح سے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ وہ تحریک کے جلسوں میں شریک رہتے اور سرسید احمد خاں اوراس تحریک کے حوالے سے قصیدے اور نظمیں پڑھتے۔ میرٹھ میں جب نوچندی کے جلسۂ عام میں سرسید کو دعوت دی گئی تو بیانؔ نے نظم کہی، جس کے دوشعر پیش خدمت ہیں:

افتخار ہند سید کے قدوم پھر بھی دکھلائے خداوند جہاں
پھر اٹھے مجلس سے گلبانگ جرس آئے پھر کاغذ سے آواز بیاںؔ

۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء کو جب سرسید کا انتقال ہوا تو بیانؔ نے جو مرثیہ کہا ہے وہ ان کے رنج وغم کا ترجمان ہے۔

قہر ہے سرسید احمدخاں بہادر کی وفات وہ زمیں کا فخر جورو آسماں سے اٹھ گیا
ہے اندھیرا چار سو یارب یہ کیا اندھیر ہے آج نجم الہند کیا ہندوستاں سے اٹھ گیا
اے علی گڑھ تیرے ویرانوں کو اب دیکھے گا کون خانہ آرائے ترقی خانماں سے اٹھ گیا
جب دیا کاندھا جنازے کو ہوئی بیتاب قوم دھڑ تڑپتا رہ گیا اور سر جہاں سے اٹھ گیا

شعر کیسے، نظم کس کی، نالہ کیا، فریاد کون
شعلۂ آتش، دل گرم بیاںؔ سے اٹھ گیا

سرسید کے علاوہ بیانؔ نے سات شخصی مرثیے مزید کہے ہیں، جن کا ذکر محمد شرف الدین ساحل نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور مولانا جعفر حسین، مولانا میر حامد حسن کنتوری اور سید احمد حسن فرقانی میرٹھی کے شخصی مرثیوں کے اشعار نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

''احباب ورشتے دار اور اکابرین قوم کی موت سے متاثر ہوکر بیانؔ نے جو مرثیے کہے ہیں، ان میں حقیقت واصلیت کو مبالغہ آرائی پر ترجیح دینے کی کوشش کی ہے اور مرحومین کی علمیت وشخصیت کا تجزیہ اس انداز سے کیا ہے کہ اس کے تمام پہلو نمایاں ہوگئے ہیں..... ان مرثیوں میں بیانؔ نے تینوں مقتدرہ ہستیوں کے علم وفضل اور شخصیت وسیرت پر روشنی ڈالی ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ ان کے اٹھ جانے سے شعروادب اور علم وعمل کی دنیا تاریک ہوگئی ہے۔''[۱۳]

Scanned with CamScanner

اس طرح بیانؔ نے کربلائی مرثیوں کے دوش بدوش شخصی مرثیوں پر اپنی قدرت کا ثبوت فراہم کیا ہے اور گویا حالی کی اس تحریک کے ہم نوا بنے کہ ہمیں اپنے اکابرین ملت او ربزرگان قوم کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بیان نے جہاں مسدس کی ہیئت میں تین مرثیے کہے ہیں وہیں انھوں نے مثلث، مخمس اور مسدس میں چند عزائیہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کی رثائی نظم ''مثلث غم'' کے درج ذیل بند دیکھیں:

گر گیا فرش خاک پر زیں سے عرش اعظم کے زیب و زین حسینؑ
کشتۂ کربلا حسینؑ حسینؑ

آسمان وزمیں میں برپا ہے تیرے ماتم کا شور و شین حسینؑ
کشتۂ کربلا حسینؑ حسینؑ

تین دن تک ملی نہ آب وغذا اے شہنشاہ مشرقین حسینؑ
کشتۂ کربلا حسینؑ حسینؑ [۱۴]

انیس ودبیر نے اردو مرثیہ کو وہ وسعت دی کہ بقول حالی اخلاقی شاعری کی اس سے عمدہ مثال اردو شاعری میں کہیں نہیں پائی جاتی ہے، جس کی تصدیق محمد حسین آزاد اور شبلی نعمانی جیسے ناقدین نے بھی کی ہے۔ انیس ودبیر کی مرثیے کی وسعت اور جدت نے ان کے معاصر شعرا کو بھی اس صنف سخن پر سنجیدہ ہونے پر مجبور کیا اور انھوں نے بھی اپنی علمیت کا مظاہرہ کیا۔ جس زمانے میں انیس ودبیر کا طوطی بول رہا تھا بیانؔ جوانی کے دور سے گزر رہے تھے۔ ان کی فکر ونظر نے بھی انیس ودبیر کے مرثیوں کا گہرا اثر قبول کیا۔ بیانؔ عزائی فضا کے پروردہ تھے، اور اہل بیت اطہار خصوصاً امام حسینؑ اور شہیدان کربلا سے محبت اور واقعۂ کربلا کی آفاقیت کے سبب انھوں نے مرثیہ نگاری پر پوری توجہ صرف کی جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے کہ قدرت نے انیس ودبیر کے بعد انھیں اس کام کے لیے منتخب کیا ہے۔

عیسیٰ کی طرح نطق کی آیت بیاںؔ کو دی منبر دیا کہ طور کی رفعت بیاںؔ کو دی
مداحی نجوم رسالت بیاںؔ کو دی حقا کی دو جہان کی دولت بیاںؔ کو دی

شقہ کھلا مرے قلم انتخاب کا
تسلیم کو جھکا وہ علم آفتاب کا

بیانؔ کے کربلائی مرثیے اگر چہ تعداد میں بہت کم ہیں لیکن ان کی فنی عظمت اور ادبیت

سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی رثائی شاعری کا مجموعہ ان کے انتقال کے بعد سید محمود علی گرامی اسسٹنٹ پروفیسر ڈویژنل کالج میرٹھ نے مرتب کر کے ''رنگ شہادت و نیرنگ بلاغت'' کے نام سے ۱۹۱۹ء میں شائع کرایا تھا۔ مذکورہ مجموعہ میں تین مرثیے موجود ہیں:

ع۔ کس چیز کی آمد ہے کہ شرکانپ رہا ہے (درحال جناب امام حسینؑ ۷۶ بند)

ع۔ میدان میں ابن شہ دلدل کی ہے آمد (درحال حضرت امام حسینؑ ۹۱ بند)

ع۔ خورشید آسمان شرف ہے سخن مرا (درحال حضرت عباسؑ علمدار ۶۵ بند)

بیانؔ کے مرثیے مناظر قدرت و فطرت کی کمی کا احساس کراتے ہیں جب کہ انھوں نے رزمیہ پر خاصی توجہ صرف کی ہے۔ یوں تو اردو مرثیوں میں رزمیہ عناصر پہلے سے ہیں لیکن میر ضمیر نے اسے فنکارانہ اسلوب عطا کیا اور انیس و دبیر نے اسے عروج بخشا۔ یہی وجہ ہے کہ بیانؔ نے بھی رزمیہ پر زیادہ توجہ دی اور کافی حد تک اسے برتنے کی کوشش کی۔ بیانؔ کا پہلا مرثیہ ہی دبیر کے مشہور مرثیے ع

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

کی تقلیدی کوشش ہے۔ بیانؔ کا مطلع ملاحظہ فرمائیں:

کس خیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے　　لشکر میں تزلزل ہے عمر کانپ رہا ہے
شیروں کا نہنگوں کا جگر کانپ رہا ہے　　خورشید لرزتا ہے قمر کانپ رہا ہے
کہتے ہیں ملک گر نہ پڑے چرخ بریں آج
ہٹ جائیں جبل یاں سے سرک جائے زمیں آج

شرف الدین ساحلؔ درج بالا بند کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''یہ پورا بند انیس کے اس بند کا بہت واضح چربہ ہے:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے　　رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیر کفن کانپ رہا ہے　　ہیبت سے سلاطین زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدرؑ کے پسر کو
جبریلؑ لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

درج بالا بند کو تحریر کرتے ہوئے شرف الدین ساحل سے تسامح ہوا ہے اور انھوں نے مذکورہ بند کو انیسؔ کا بتایا ہے، جبکہ یہ دبیرؔ کا بہت ہی مشہور مرثیہ ہے، جسے ''دفتر ماتم'' کے علاوہ

Scanned with CamScanner

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے ''انتخاب مراثی'' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مذکورہ بند کے چوتھے مصرعے کو بھی ساحل نے لفظ بدل کر غیر فصیح بنا دیا ہے جبکہ اصل مصرع ہے ع

ہر قصر سلاطین زمن کانپ رہا ہے

ساحل نے بیانؔ کے مذکورہ بند پر بہت ہی سطحی تبصرہ کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مرثیے کی فضا اور اس کے فنی رموز سے ناواقف ہیں۔ بیان کو مرثیے کے نظم کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ سراپا نظم کرتے ہوئے انھوں نے جن لفظیات کا استعمال کیا ہے، وہ حضرت عباس کی جاذب نظر شخصیت سے قاری کو متعارف کراتی ہے۔ چشم و ابروئے مبارک کی صورت گری بیانؔ کے جادو نگار قلم سے ملاحظہ فرمائیں اور حسن نظم کی داد دیں:

حق بین و حق پسند و حقیقت نگر ہے چشم　　شان خدا، کرشمۂ حق، دیدہ ور ہے چشم
فیاض، پردہ پوش، کریم السیر ہے چشم　　قربان نور دیدۂ خیرالبشر ہے چشم
محبوب ہے یہ آنکھ شہ مشرقین کو
آہو، طفولیت سے ہے پیارا حسینؑ کو

ابرو کا یہ عروج، یہ رفعت، یہ عزوشاں　　بالائے چشم حضرت عباسؑ ہے مکاں
یاں سجدہ فرض عین ہے مردم کو بے گماں　　جھک جھک گیا سر قلم صانع جہاں
ابرو نہیں ہے مصحف روئے سعید ہے
سجدے کی آیتیں ہیں کتاب مجید ہے

مرثیہ کا ایک اہم جزو رجز ہے اور یہ رزمیہ شاعری کا وہ حصہ ہے جس پر مرثیہ نگاروں وہ فنکارانہ جودت دکھائی ہے کہ اردو شاعری کی کوئی صنف اس میں مرثیے کے مقابل نہیں ہے۔ جیسا کہ گذشتہ سطور میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ بیانؔ کو رزمیہ شاعری میں کمال حاصل ہے۔ بیان نے جو رجز لکھا ہے وہ خاندانی شجاعت و دلیری کے ساتھ خاندانی بزرگی و شرافت کو پیش کرتا ہے اس لیے کہ ان کی نگاہ میں قابل فخر خاندانی بزرگی نہیں بلکہ تقویٰ الٰہی پر منحصر کردار کی بلندی ہے جس سے متصف امام حسینؑ کے بزرگ تھے۔ امام حسینؑ کے رجز میں مندرج خصوصیات کو ملاحظہ فرمائیں:

میداں میں کھڑے ہو کے پکارے شہ ذی شاں　　ہم محرم اسرار ہیں، ہم معنیِ قرآں
ہم سرِّ خدا، آئینہ حق، حجت یزداں　　قندیل حرم، قبلۂ دیں، کعبۂ ایماں
شمع ازلی جلوۂ بالا ہے ہمارا

کونین کی محفل میں اجالا ہے ہمارا

خادم ہیں ملک، خادمہ جنت ہے ہماری بخشش کی جو دولت ہے، بدولت ہے ہماری
واجب ہے ادب، فرض اطاعت ہے ہماری واللہ ولا اجر رسالت ہے ہماری

لو ہاتھ میں قرآن کہ سائل ہوں میں تم سے
واقف نہیں کیا آیۃ لا اسئلکم سے

تلوار کی توصیف و تعریف مرثیہ نگاروں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے اور انھوں نے فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اسے وہ بلندی فکر عطا کی ہے کہ اردو شاعری میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسے بیان کرنے میں شاعروں نے مبالغہ آرائی کے فن کو بھی معراج عطا کی ہے۔ بیان نے بھی اسے فنکاری کا جوہر عطا کر کے اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔

کیا حسن خدا ساز میں بیساختہ پن ہے زہراب فگن، زہرہ جبیں، زہرہ شکن ہے
لہراتی ہوئی چلتی ہے افعی کا چلن ہے دم زہر ہلاہل ہے زمرد کا بدن ہے

سوراخ تف زہر سے اعدا کا جگر ہے
سرسبز ہوا دیں، یہ زمرد کا اثر ہے

خوں چاٹتی پھرتی ہے لگا منہ میں لہو ہے یوں ابر میں ہے شعلہ فشاں صاعقۂ خُو ہے
حیرت ہے کہ تن سبز ہے اور آئینہ رو ہے مشکیں ہے غلاف اس کی بھی اک وجہ نکو ہے

پانی کے سبب چشمۂ ظلمات ہوئی ہے
یاں خضر و سکندر کی ملاقات ہوئی ہے

بہر حال بیانؔ نے اپنے مرثیوں میں گھوڑے کی صفات اور بین کی پیشکش میں بھی سلیقہ مندی کا ثبوت دیا ہے اور اپنے فنکارانہ اسلوب سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ مرثیہ نگاری میں بھی میرٹھ کا نام سربلند کیے ہوئے ہیں۔

**عشیرؔ لکھنوی:**

شیخ امداد علی عشیرؔ مرثیہ گو شیخ گوہر علی مشیرؔ کے برادر خورد تھے۔ عشیرؔ کا اصل وطن لکھنؤ تھا اور ذاکر حسین فاروقی نے انھیں دبیرؔ کا شاگرد لکھا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کے دوران عشیرؔ پر بغاوت کا الزام ہونے کے سبب لکھنؤ سے رام پور آ گئے۔ بعد میں حیدر آباد ہوتے ہوئے الور پہنچے۔ غدر کے بعد برطانوی حکومت کی عام معافی کے اعلان کے بعد عشیرؔ نے لکھنؤ کے بدلے

Scanned with CamScanner

میرٹھ میں قیام کیا اور یہیں اکیانوے برس کی عمر میں انتقال کیا۔

ڈاکر حسین فاروقی نے ''دبستان دبیر'' میں لکھا ہے کہ:

''عشیر نے تقریباً سوا سو مراثی اور ڈھائی سو قصائد یادگار چھوڑے ہیں۔ جواب بھی ان کے خاندان والوں کے پاس محفوظ ہیں۔''[16]

عشیر کے کلام میں اصلاح وموعظت کے پہلو کی فراوانی ہے پھر بھی فضائل ومصائب سیدالشہدا کا بیان بھی بخوبی پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اجزائے مرثیہ کے ساتھ ساتھ واقعہ نگاری اور کردار نگاری کا بھی موثر بیان ملتا ہے۔ اصحاب امام حسینؑ کی کردار نگاری کا خوبصورت بیان قابل دید ہے:

سب تھے قمر رکاب، قمر وش، قمر نژاد دیں یاد، قبر یاد، اجل یاد، حشر یاد
احمدؐ کے کلمہ گو تھے، یداللہ کے خانہ زاد گو نزع ہے پر اصل تھے سمجھے ہوئے جہاد
اہل وقار ذی حشم اشراف قوم کے
مشتاق تھے نمازوں کے عادی تھے صوم کے
خوش لہجہ، خوش سلیقہ، خوش ایماں، خوش اعتقاد خوش فکر وخوش بیان وخوش اطوار وخوش نہاد
خوش وضع، خوش معاملہ، خوش رو، خوش اعتماد خوش ذات وخوش صفات وخوش اسلوب وخوش اراد
جن اور انس کے لیے بہتر ملک سے ہیں
خوش ہیں ہر اک شکل پہ ناخوش فلک سے ہیں

عشیر کے مرثیوں میں میرٹھ اور رام پور میں قیام کے باوجود علاقائی اثرات نہیں ہیں بلکہ لکھنوی زبان کا بہترین نمونہ ہے۔ ڈاکٹر نصرت فاطمہ نے ان کے مراثی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''کلام عشیر میں لکھنوی مرثیہ گوئی کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ آپ کے انداز بیان میں سہل اور شیریں زبان پائی جاتی ہے۔ نیز رعایت لفظی سے گریز کیا گیا ہے، عشیر نے مرثیوں سے اخلاقیات، تعمیر کردار اور دین کی تبلیغ کا کام بھی لیا ہے۔ مراثی میں موضوعات کا تنوع آپ کی خاص خوبی ہے۔''[17]

عشیر نے بے ثباتی دنیا کے موضوع کو بہت ہی سلیقہ سے نظم کیا ہے۔ دنیا اور اس کی بے

Scanned with CamScanner

ثباتی کا عبرتناک بیان موثر پیرایہ میں ملاحظہ فرمائیں:

یہ رہ وہ رہ ہے جس میں مسافر کو ہے خطر کھٹکا قدم قدم پہ ہے لٹنے کا الحذر
آفت کی منزل ہے یہ قیامت کا ہے سفر نے قدرت مفر ہے نہ یارائے درگزر
اک دن یہ رنج دل پہ اٹھانا ضرور ہے
آیا ہے جو یہاں اسے جانا ضرور ہے

تقدیر جبکہ عالم غربت دکھائے گی دم لے کہیں پہ روح یہ مہلت نہ پائے گی
اہل دول کے ساتھ یہ دولت نہ جائے گی شاہوں کے کام حشمت دنیا نہ آئے گی
محفوظ ہے وہی جو تعلق سے پاک ہے
انجام کار خاک کے پتلے کا خاک ہے

**حقیر، غلام شبیر، ابن امداد علی عشیر:**

مشہور مرثیہ گو شیخ گوہر علی مشیر شاگرد مرزا دبیر حقیر صاحب کے چچا تھے۔ حقیر شیخ سجاد حسین عشیر کے گھر ۱۸۶۱ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے زمانہ میں گرفتاری سے بچنے کے لیے لکھنؤ کو چھوڑ کر چھپتے چھپاتے میرٹھ آگئے تھے اور یہاں نام بدل کر رہنے لگے تھے ان کا اصلی نام شیخ امداد علی تھا۔ ہنگاموں کے زمانہ میں گرفتاری سے بچنے کے لیے لکھنؤ کو چھوڑ کر فرضی نام سے ہی جانے جاتے رہے اور سکونت ترک نہ کی۔ ان کو انگریزوں اور انگریزی سے سخت نفرت تھی۔ اسی سبب اپنی اولاد کو بھی انگریزی تعلیم سے دور رکھا۔ ۱۸

حقیر صاحب نوجوانی میں ہی فالج کا شکار ہو کر جسمانی اعتبار سے تقریباً معذور ہو گئے تھے اور سارا وقت گھر پر ہی گزارا کرتے تھے۔ کم سنی میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔ شاعری میں اپنے والد عشیر صاحب کے شاگرد تھے۔ مذہبی رجحان رکھتے تھے۔ ان کی شاعری بھی اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ آپ نے تقریباً ۷۵ سال کی عمر پائی اور عمر عزیز کا بیشتر حصہ فکر سخن میں صرف کیا۔ ۱۹۳۶ء میں انتقال فرما گئے۔ نمونۂ کلام:

فضہؓ نے کہا کوٹھے پہ وہ پڑھتی ہیں قرآن تشریف وہیں لے گئے پیغمبرؐ ذی شان
وہ محو تلاوت ہیں کہ چادر کا نہیں دھیان فرمایا ردا اوڑھ لے نانا ترے قربان
جب تک وہ تمہیں برہنہ سر پائے گا زینبؑ

Scanned with CamScanner

خورشید فلک پر نہ کبھی آئے گا زینبؑ

یہ کہہ کے ردا آپ نواسی کو اڑھادی واں مہر جہاں تاب نے عالم کو ضیادی
اور چاندنی اک دھوپ کی شفاف بچھادی حضرت نے جبیں خاک پہ سجدے میں بچھادی
منہ اشک گہرتاب سے دھوتے ہوئے اٹھے
سجدے سے اٹھے آپ تو روتے ہوئے اٹھے

زینبؑ نے کہا روتے ہو تم کس لیے نانا یہ تو ہے محل شکر کا اور فخر کی ہے جا
حضرت نے کہا تیرے مقدر کا ہے رونا آغاز تو یہ ہے تیرا انجام وہ ہوگا
شانوں میں رسن پاؤں میں زنجیر ہو بیٹا
اس طرح سے تم شہروں میں تشہیر ہو بیٹا [۲۰]

**شاؔد میرٹھی، للتا پرشاد:**

عرفان عباسی کے تذکرہ شعرائے اتر پردیش کے حوالے سے نور احمد نور میرٹھی نے لکھا ہے کہ:

''میرٹھ کے ایک معزز اور ذی حیثیت خاندان کے فرد منشی جنگ بہادر جنگ میرٹھی (م۱۹۰۷ء) کے صاحبزادے للتا پرشاد ۱۸۸۵ء کے قریب میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ جنگ صاحب اپنے زمانے کے مشہور صاحب دیوان شاعر تھے۔'' [۲۱]

انھوں نے زبان وادب کی بڑی خدمت کی۔ ناظم الہند اور رسالہ دلشادان کی ادارت میں نکلتے تھے۔۱۹۱۲ء میں اپنے قیام اجمیر کے زمانے میں وہاں اصلاح زبان اور خدمت ادب کے لیے ایک انجمن بھی قائم کی تھی۔ شاد صاحب نے تمام اصناف میں جوہر دکھائے۔ اسلامی عقائد پر مراثی کے علاوہ سلام، نعت ومنقبت اور نظمیں بھی ملتی ہیں۔

۲ر نومبر ۱۹۵۹ء کو جہان فانی سے کوچ کیا۔ ساقی نامہ کے ذیل کے بند ملاحظہ فرمائیں:

اے ساقی کوثر نظر لطف عطا کر مخمور بنادے مئے گل رنگ پلاکر
کیوں ساغر توحید چھپاتا ہے دکھاکر یوں طاق میں شیشہ کو نہ رکھ آج چھپاکر
محفل میں ذرا رنگ جمے بے خبری کا
اس افکر پرواز پہ دھوکہ ہو پری کا

خیمے سے جو باہر وہ چلے مثل گل تر دی خوش خبری فتح کی بلبل نے چہک کر

وابستۂ گیسو ہوا سنبل بھی سراسر تھا داغؔ کا مطلع یہی نرگس کی زباں پر

سب لوگ جدھر وہ ہیں ادھر دیکھ رہے ہیں
ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

اشہب سرمقتل، ادھر آیا ادھر آیا کرتا ہوا چھل بل ادھر آیا ادھر آیا
اللہ رے کس بل ادھر آیا ادھر آیا بجلی تھا کہ کوتل ادھر آیا ادھر آیا

یوں جاتا تھا وہ بادصبا جاتی ہے گویا
گلشن میں دبے پاؤں ہوا جاتی ہے گویا

شادؔ کا مرثیہ ''نالۂ دلخراش'' بیحد مقبول ہوا۔ آپ نے راجستھان میں رثائی ادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ڈاکٹر نصرت فاطمہ اس سلسلے میں لکھتی ہیں:

''شادؔ کے کلام میں غزل ومنقبت، مراثی وسلام اور رباعیات پائی جاتی ہیں۔ آپ کو امام حسینؑ سے بے پناہ عقیدت ومحبت تھی۔ آپ نے ۱۹۵۸ء میں کوٹہ سے جو پندرہ روزہ اخبار 'دلشاد' جاری کیا تھا، اس کا حسینؑ نمبر نکالنا آپ کی عقیدت کا بین ثبوت ہے۔ آپ کے رثائی کلام میں ایک مرثیہ 'نالۂ دلخراش' پچپن بند میں درحال حضرت عباسؑ علمدار اور ایک عزائی مجموعہ 'پنجۂ پنجتن' شامل ہیں۔''۲۲

شادؔ کا مرثیہ 'نالۂ دلخراش' بے حد معروف ہوا اور اس کی مقبولیت کے باعث یہ ۱۹۵۵ء میں تیسری بار الہ آباد پریس دہلی سے شائع ہوا۔ اس مرثیہ کے تعلق سے راجستھان میں اردو ادب کے مشہور محقق ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی رقم طراز ہیں:

''اس میں انیسؔ ودبیرؔ کی انتہائی پیروی کی کوشش کی گئی ہے اور ایک حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے۔''۲۳

گذشتہ سطور میں نالۂ دلخراش کے کچھ بند پیش کیے گئے ہیں، جو ساقی نامہ اور گھوڑے کی تعریف میں ہے۔ ذیل میں تلوار کے حوالے سے شاد کے دو بند ملاحظہ فرمائیں اور ان کی صناعی کی داد دیں:

گردن پہ ابھی تھی ابھی سر کاٹ رہی ہے وہ دیکھیے آنکھوں میں نظر کاٹ رہی ہے
پہلو میں نہیں دل تو جگر کاٹ رہی ہے کٹ سکتی نہیں عمر مگر کاٹ رہی ہے

Scanned with CamScanner

جن کو تھی یہ امید کہ سو سال جئیں گے
کہنے لگے واللہ نہ فی الحال جئیں گے

میں شیر نیستان کرامت ہوں خبردار میں خسرو اقلیم ولایت ہوں خبردار
میں مہر درخشان شرافت ہوں خبردار میں جوہر شمشیر شجاعت ہوں خبردار

معمولی سی لغزش مرے واروں میں نہیں ہے
واللہ کوئی مجھ سا ہزاروں میں نہیں ہے

**لچھمی نرائن، سخا میرٹھی:**

ایک معزز افسر کی حیثیت سے عوام الناس میں روشناس تھے اور گلابی شہر جے پور میں عہدۂ فوجداری پر مامور تھے۔ مشاعروں اور محافل مناقب میں بہت دلچسپی سے شریک ہوتے تھے۔ محمد چاند میاں عرف عطاء اللہ خاں عطا کے شاگرد تھے۔

معراج محبت مرتبہ سید احمد علی شاہ جعفری قمر (پ ۱۹۰۴ء) ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا جس میں پہلے حصہ میں فارسی کلام اور دوسرے حصہ میں نعت، منقبت، سلام ومراثی، غزلیات ومنظومات ہیں۔

نور احمد نور نے تین سلام اور دو رثائی رباعیاں نقل کی ہیں، جن میں ایک اردو اور ایک فارسی میں ہے۔ سلام کے مطلع اور ایک رباعی پیش کی جارہی ہے:

ع- مجرائی میں ہوں خاص سلامی حسینؑ کا
ع- دے کے سر ایماں پہ یہ ایماں پہ احساں کر دیا
ع- سلامی خیمے سے اب سبط پیمبرؐ نکلتے ہیں

منصور پہ ہر طرح سے فایق ہیں حسینؑ کیا بندے ہیں اللہ کے عاشق ہیں حسینؑ
کچھ بھی نہ کہا زباں سے کرنا کیسا خود بیں نہیں وہ عاشق صادق ہیں حسینؑ [۲۴]

**قلق میرٹھی:**

مولا بخش قلق میرٹھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وہیں پائی اور جب بارہ سال کے ہوئے تو تحصیل علم کے لیے ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء میں دہلی آکر دہلی کالج میں داخل ہوگئے۔ فارسی زبان کی تعلیم مولانا صہبائی سے حاصل کی۔ علم صرف ونحو، منطق اور دوسرے علوم عربیہ ملا انتظام علی سہارنپوری سے حاصل کی اور طب کی تعلیم کا اکتساب حکیم غلام نقش بند خاں سے کیا۔

Scanned with CamScanner

انگریزی زبان بھی دہلی کالج ہی میں سیکھی۔

اسی زمانے میں ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی کی آخری بہار تھی اور غالب، مومن، ذوق اور ظفر کے علاوہ متعدد چھوٹے بڑے شعرا داد سخن دے رہے تھے۔ قلق نے اپنے مزاج کے پیش نظر جس میں نئے پن کے ساتھ معنی آفرینی، نازک خیالی کی طرف رجحان موجود تھا، حکیم مومن خاں مومنؔ کی شاگردی اختیار کی اور اسی لیے مومن خاں کی خاص توجہ ان پر ہوگئی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک قلق دہلی میں رہے لیکن جب بغاوت وفساد نے دہلی کی صورت بگاڑ دی تو وہ حالات سے مجبور ہوکر اپنے آبائی وطن میرٹھ چلے آئے۔

قلق کیوں چھوڑتا دہلی کو کیوں میرٹھ میں آ رہتا
گدائی کے بھروسے پر لٹایا بادشاہی کو [۲۵]

قلق کے کلیات کی تقریظ خواجہ الطاف حسین حالی نے لکھی ہے۔ جمیل جالبی نے ان کی غزلوں کی انفرادیت کا کما حقہ محاکمہ کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کی جواہر منظوم جو انگریزی نظموں کا اردو ترجمہ ہے جس کا ذکر گارساں دتاسی نے اپنے خطبوں میں کیا ہے، اس پر تفصیلی بحث کی ہے لیکن مرثیے پر کچھ بھی نہیں لکھا ہے صرف یہی لکھا ہے کہ:

''قلق نے کم و بیش جملہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے ہاں غزل، مخمس، مسدس، واسوخت بھی ملتے ہیں اور مرثیہ، قصائد، قطعات اور رقعات وغیرہ بھی۔ قادرالکلام اور پختہ مشق ہونے کے باعث وہ ہر صنف سخن میں اپنا رنگ جما لیتے ہیں۔'' [۲۶]

طاہر حسین کاظمی نے ڈاکٹر جلال انجم کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''قلق ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳ء میرٹھ میں ایک باوقار خاندان میں پیدا ہوئے۔ قلق کا انتقال ۱۸۸۰ء کو ہوا۔'' [۲۷]

''کلیات اردو قلق'' میں ایک مرثیہ امام حسینؑ کے حال پر مشتمل موجود ہے جس سے ان کے فکر وفن میں جامعیت اور شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مطلع ملاحظہ فرمائیں:

جب صبح کربلا میں دہم کی ہوئی نمود — جائے شفق فلک سے عیاں تھا ہجوم دود
گرنا نگاہ نور سے تھا مہر کا صعود — ہر ذرہ خیرگی سے تھا خال رخ ہنود

تھا نور دور مہر سے اور مہر نور سے
خود کو ٹٹولتا تھا ہر اک قب دور سے ۲۸

قلق کے مذکورہ مرثیے کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مرثیہ کے جملہ اجزائے ترکیبی کا خیال رکھا ہے۔ عربی و فارسی کی تراکیب اور الفاظ کا دروبست یہ بتاتا ہے کہ وہ دبیرؔ کے طرز کو پسند کرتے تھے اور اپنے مرثیے میں انھیں کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ جناب زینبؑ کا بین ملاحظہ ہو جس میں بہن بھائی کے مکالماتی لہجہ نے ڈرامائی کیفیت پیدا کر دی ہے:

بھیا تمام چاہنے والوں کو روچکی کمبخت ہوں کہ گود کے پالوں کو روچکی
سینہ سے داغ داغ کے لالوں کو روچکی باغ علیؑ کے سارے نہالوں کو روچکی
سنسان ہے جہان بھرا گھر کیا نثار
قربان جاؤں سب ہی کو تم پر کیا نثار

امام حسینؑ جناب زینبؑ کو صبر کی تلقین کرتے ہیں:

شہ نے کہا پکار کے زینبؑ سے اے بہن آخر رضائے حق میں ہے بہبود ہر سخن
اس خانداں کا صبر ہمیشہ سے ہے چلن ہیں واسطے ہمارے ہی دنیا کے سب محن
تم صابرہ کی بیٹی ہو درکار صبر ہے
لازم ہے صبر حصۂ ابرار صبر ہے

قلق نے دبیرؔ کی پیروی کرتے ہوئے روایتی انداز میں گھوڑے کی تعریف، رجز، تلوار کی صفائی اور امام حسینؑ کی جنگ کے بیان میں تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ بیانیہ کو بھی سلیقے سے نظم کیا ہے۔ امام حسینؑ کی شہادت کا بند ملاحظہ فرمائیں:

غش کھا کے ذوالجناح سے ناچار گر پڑے شہ کیا گرے کہ حیدرؑ کرار گر پڑے
لغزش سے حق کے احمدؐ مختار گر پڑے حمّال عرش فرش پہ اک بار گر پڑے
دیوار کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا
قرآن ٹکڑے ہو کے سر فرش گر پڑا

قلق نے مرثیہ کے مقطع میں اپنی شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ حریفوں کی بدخوئی کا ذکر کرتے ہوئے اہلبیت رسولؐ و آل رسولؐ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے:

بس اے قلق خموش، نہیں طاقت کلام حق گوئی تیرا کام ہے، حق تجھ پہ اختتام

Scanned with CamScanner

جلتے ہیں جو حریف انھیں کی ہے اصل خام اہل حسد سے ڈر نہیں سنتے ہیں خود امام
تو شاعروں میں مستحق یاد ہوگیا
عرضی تری قبول ہوئی ،صاد ہوگیا

بہر حال قلق میرٹھی نے جہاں مذکورہ مرثیے سے لفظ و بیان پر اپنی قدرت کو واضح کیا ہے وہیں اپنے کلیات میں رثائی رباعیاں بھی شامل کر کے رباعی جیسے مشکل فن پر بھی اہلبیت علیہم السلام سے اپنی محبت وعقیدت کو شعریات کا روپ دے کر اپنی علمی وادبی برتری ثابت کی ہے۔

**احسنؔ، سید ظفر احسن:**

سید ظفر احسن کا قصبہ ہاپوڑ ضلع میرٹھ وطن تھا۔ آپ کے والد سید محمد علی ہاپوڑ کے رئیس اور مشہور وکیل تھے۔ احسن صاحب کو بچپن ہی سے شعر وسخن کا شوق تھا۔ آپ نے ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی مگر قصیدے، منقبت، رباعی اور سلام کے علاوہ مرثیہ خوب کہتے تھے آپ ایک اچھے مرثیہ نگار کے ساتھ ساتھ اچھے مرثیہ خواں بھی تھے۔ احسن صاحب کے مرثیوں اور سلاموں کا مجموعہ ''حدیقۂ حسن معروف بہ بیان احسن'' ۱۳۲۳ھ میں مطبع قاسمی میرٹھ سے طبع ہوا تھا۔ اس کی ایک جلد ذخیرۂ مراثی سید محمد رشید رئیس انباری مقیم حال لکھنؤ میں محفوظ ہے۔ (سید محمد رشید کی زندگی ہی میں یہ ذخیرہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کناڈا لے گئے اس طرح لکھنؤ کا یہ عظیم الشان ذخیرہ سات سمندر پار چلا گیا اور وہاں محفوظ ہوگیا)

مرثیہ نگاران اردو کے مولف مرزا امیر علی بیگ جونپوری کے مطابق:

''ان کے مرثیے بلند پایہ مرثیوں کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ محاورہ کا برمحل استعمال، زبان کی بندش اور روانی ان مرثیوں کی خصوصیت ہیں۔''

حضرت امام حسین کی جنگ کو سید ظفر احسن، احسنؔ نے بڑے خوبصورت انداز میں نظم کیا ہے:

تنہا شہ دیں رن میں جو آئے تو یہ دیکھا تلواریں لیے جنگ کو آمادہ ہیں اعدا
فرمایا کہ کیا قصہ ہے اب اے سگ دنیا بتلاؤ تو میں کون ہوں آوارہ وتنہا
ہوں دشت میں دو روز سے پیاسا کہ نہیں ہوں؟
ہوں احمدؐ مرسل کا نواسہ کہ نہیں ہوں؟
واقف نہ ہو گر مجھ سے تو پہچان لو مجھ کو احمدؐ کا نواسہ ہوں میں اب جان لو مجھ کو

Scanned with CamScanner

صادق ہوں میں زہراؑ کا پسر مان لو مجھ کو دو امن تو اے پیروِ سلطان ہو مجھ کو
چلائے عدو سچ ہے کہ بیٹے ہو علیؑ کے
ہم جانتے ہیں سب کہ نواسے ہو نبیؐ کے[۲۹]

**حسنؔ، حکیم محمد حسن:**

نور احمد نور میرٹھی کے مطابق حکیم محمد حسن ابن حکیم خادم حسین یکتا بن حکیم کریم بخش میرٹھ کے معروف اطبا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا میلاد نامہ نور محمدی نظم ونثر کے مخلوط انداز میں لکھا گیا ہے اور ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ نسخہ مطبوعہ ۱۸۹۱ء پنجاب پبلک لائبریری، لاہور میں موجود ہے۔ اس سے ان کے اسلوب کی ندرت اور قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ نور احمد نورؔ یہ تفریق نہیں کرتے کہ حسنؔ نے یہ میلاد نامہ کس ہیئت میں لکھا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ چند اشعار درج ذیل ہیں جبکہ حسنؔ نے یہ میلاد نامہ مسدس کی ہیئت میں لکھا ہے۔[۳۰]

اللہ رے بحر ہیبت محبوب حق کا جوش
آتش کدے تھے جتنے وہ سب ہوگئے خموش
باطل ہوئے علوم اڑے کاہنوں کے ہوش
برپا تھا ساحروں میں بھی فریاد کا خروش
بت خانے منہدم ہوئے لات وہبل گرے
کعبہ میں جتنے بت تھے وہ سب منہ کے بل گرے

نور احمد نورؔ میلاد نامہ میں سے نبی کریم ﷺ کے بین کے بند کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''نبی کریم ﷺ کی وفات مبارکہ کے بیان میں مرثیہ کی سی فضابندی کا احساس ہوتا ہے۔'' امام حسینؑ کی حالت زار کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

نانا کے کبھی چہرہ سے چہروں کو ملاتے
ہاتھوں کو اٹھا کر کبھی آنکھوں سے لگاتے
خوابیدہ سمجھ کر کبھی بازو کو ہلاتے
کرتے کبھی فریاد کبھی اشک بہاتے
کہتے تھے کبھی آنکھیں نہیں کھولتے نانا

Scanned with CamScanner

آزردہ ہیں ایسے کہ نہیں بولتے نانا

درج بالا بند کا اسلوب اور اس کے بین کا بیانیہ اسے مرثیہ ثابت کرتا ہے۔ چونکہ مرثیہ کو غیر سنجیدہ قارئین نے صرف واقعۂ کربلا سے مخصوص کر دیا ہے، جبکہ رثائی ادب میں واقعہ کربلا کے ساتھ ساتھ، رحلت حضور اکرم، شہادت علیؑ، شہادت بی بی فاطمہؑ اور ائمہ طاہرین کے مراثی سے ہمارے ادب کا دامن بھرا پڑا ہے۔ واقعہ کربلا کے علاوہ ان موضوعات پر بھی سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے حسنؔ کا نام شعرائے میرٹھ میں انفرادی حیثیت کا حامل ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اس اہم موضوع پر بھی مرثیہ کہا۔ اس لیے کہ ان کے میلاد نامے میں سلاست و روانی اور بیان میں خلوص و صداقت کے ساتھ نبیؐ و آل نبیؐ سے والہانہ عقیدت بھی نمایاں ہے۔

علی جواد زیدی مرحوم نے دو ماہی ''العلم'' بمبئی کے ''نعت خیر المرسلین نمبر'' اور اس سے قبل علی عباس حسینی نے ''اردو مرثیہ'' میں اس موضوع کی طرف توجہ دلائی تھی۔ بعد میں عظیم امروہوی نے نعتیہ مرثیوں کا ایک مجموعہ شائع کر دیا اور یہ واضح کر دیا کہ اردو مراثی میں نعت کا معتد بہ ذخیرہ موجود ہے جس پر سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے تا کہ نعتیہ مراثی کے اس پہلو سے بھی عاشقان رسولؐ و آل رسولؐ واقف ہو سکیں۔

میرٹھ شہر جہاں اپنی ادبی و شعری روایت کے لیے مشہور ہے وہیں یہاں کے تعلیمی اداروں نے بھی ادبا و شعرا کی تربیت میں اہم رول ادا کیا ہے۔ فیض عام کالج اور میرٹھ کالج کے علاوہ میرٹھ کا منصیہ عربی کالج اس معاملے میں سرفہرست ہے، جس کے بانی منصب علی خاں کے خلوص کا نتیجہ تھا کہ یہاں ہر دور میں اہل علم، شعرا، ادبا و فقہا نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ یہاں کے شعرا نے رثائی ادب کی ترویج و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس درسگاہ کے متعلق شعرا و ادبا میں نسیم امروہوی، ظہور جارجوی، جون ایلیا، ریحان زیدی امروہوی، شہاب کاظمی، شاہد نقوی، ڈاکٹر صفدر حسین، مسعود رضا خاکی کے علاوہ موجودہ عہد میں انور ظہیر انور میرٹھی اور منصیہ کالج کے متولی و منتظم فخری جعفری کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ متذکرہ شعرا ایسے ہیں جن کے بغیر میرٹھ ہی نہیں اردو کی رثائی ادب کی تاریخ نامکمل سمجھی جائے گی۔ ان شعراء کے علاوہ امید فاضلی اور ظہور جارجوی ایسے شاعر ہیں جنھیں جدید مرثیہ نگاری کی تاریخ میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

**ظہور جارچوی: جرار حسین:**

Scanned with CamScanner

ظہورؔ جارچوی اصلاً جارچہ ضلع غازی آباد کے رہنے والے ہیں لیکن ان کی تعلیمی سرگزشت میرٹھ میں مکمل ہوئی اور میرٹھ ہی میں وہ بحیثیت شاعر مشہور ہوئے۔ منصیہ عربی کالج کی اعلیٰ اسناد حاصل کی یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا آغاز اعتقادی شاعری سے ہوا۔ انھوں نے خود کہا ہے:

ہم کو جرار ہی سے جانتے ہیں اہل سخن
ہم کو احسان تخلص بھی گوارا نہ ہوا

طاہر حسین کاظمی نے لکھا ہے کہ:

''مولانا جرار کے مراثی کی حیثیت مجموعی طور پر روایتی ہے، ایک دو مرثیے میں جدید رنگ بھی اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے بھائی کی موت پر ایک شخصی مرثیہ بھی کہا ہے۔''[۳۱]

طاہر حسین کاظمی کی اطلاع کے مطابق ان کے زیادہ تر مراثی غیر مطبوعہ ہیں جو مرثیے ان کی نظر سے گزرے ان کے مطلعے درج ذیل ہیں:

(۱) کشور نظم کا یارب مجھے سلطاں کردے (۶۴ بند)
(۲) رہرو جادۂ تسلیم و رضا ہیں شمشیر (۴۷ بند)
(۳) آج شبیر پہ کیا غم کی فراوانی ہے (۲۷ بند)
(۴) وہ کون سا یوسفؑ ہے اداروتی ہے جس کو (۶۵ بند)
(۵) ہر چیز ہے یکتا چمن کون و مکاں میں (۱۰۸ بند)
(۶) کونین کا سردار حسینؑ ابن علیؑ ہے (۴۶ بند)
(۷) گلزار حسنؑ نذر خزاں ہو گیا رن میں (۱۰۵ بند)
(۸) مہکے گا سربزم فصاحت کا چمن آج (۷۸ بند)
(۹) اب ذکر علمدار حسینی ہے خبردار (۹۱ بند)
(۱۰) آج تو پار مجھے قلزم غم کرنا ہے (۷۸ بند)
(۱۱) اے دیدۂ تر عیش و مسرت کو ہوا کیا (شخصی مرثیہ ۲۴ بند)

ظہورؔ جارجوی انیسؔ اور خانوادۂ انیسؔ کے خوشہ چین ہیں۔ مرثیے کے مطلعوں سے

Scanned with CamScanner

اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زیادہ تر انیسؔ کی پیروی کرتے ہوئے اسی رنگ کے مرثیے کہے ہیں۔ جرارؔ کے مرثیہ ''کشور نظم کا یارب مجھے سلطاں کردے'' سے ان کی یہ وابستگی ظاہر ہوتی ہے، جس میں انھوں نے انیسؔ اور خاندان انیسؔ کے دوسرے شعرا کا پرخلوص لہجے میں ذکر کیا ہے:

کشور نظم کا یارب مجھے سلطاں کردے بخش غنچے کو نمو رشک گلستاں کردے
حسن جگنو کا بڑھا کر مہ تاباں کردے ذرّہ خاک کو خورشید درخشاں کردے
ناتواں مور بھی ہم دوش سلیمانؑ ہوجائے
تو اگر چاہے تو قطرہ دُرِغلطاں ہوجائے

رہنا تو قلزم مواج فصاحت میں انیسؔ معتقد ہوں مرے اس بزم عقیدت کے جلیسؔ
چست ہوں بندش الفاظ معانی میں نفیسؔ دیکھنے والے پکار اٹھیں مضامیں ہیں سلیسؔ
تو جو مونس ہو تو آسانی ہر اک مشکل ہو
مرثیہ گوئی کا عاصی کو شرف حاصل ہو

طاہر حسین کاظمی نے جرار حسین ظہورؔ جارچوی کے مراثی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''شاعری کا جوہر شبلی کے مطابق جذبات یعنی محسوسات کی تصویر کشی میں کھلتا ہے۔ جرار نے اپنے مراثی میں جہاں کہیں جذبات کی عکاسی کی ہے، کامیاب تصویر کشی کی کوشش کی ہے۔''[۳۲]

جرار نے جہاں روایت سے ہٹ کر جدت کا سہارا لیا ہے وہیں انھوں نے روح مرثیہ یعنی بین یا مرثیت کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ جدید انداز کے مرثیوں میں بھی مصائب کے بیان پر زور دے کر مرثیت کا پہلو کمزور ہونے نہیں دیا ہے۔

قدر افزائی غم ہوتی رہی ہے کیا کیا شیرخواروں میں بھی اس گھر کے رہا یہ جذبہ
تھے تو اصغرؑ مگر اصغرؑ نے بڑا کام کیا تیر جب آیا ہمک کر اسے گردن پہ لیا
پیاس کی کوئی علامت نہ رہی ہونٹوں پر
لذت غم جو ملی آئی ہنسی ہونٹوں پر

حرمت غم کے نگہبان رہے اہل حرم بال بکھرائے پریشان رہے اہل حرم
رات دن موت کے مہمان رہے اہل حرم غم پہ سوجان سے قربان رہے اہل حرم

Scanned with CamScanner

عظمت غم کا یہ احساس گرفتاروں میں
ننگے سر خطبے دیے شام کے بازاروں میں

بہر حال روایتی اور جدید دونوں مرثیوں میں ظہور جارچوی نے روانی، برجستگی، معنویت، بلاغت اور نئی نئی تشبیہات اور جدید علامات و استعارات کے ذریعہ مرثیے کی فنی رفعتوں کو وسعت عطا کی ہے۔

**نسیم امروہوی:**

میرٹھ کی ادبی روایت کا جب بھی ذکر ہوگا نسیم امروہوی کا تذکرہ ضرور کیا جائے گا۔ نسیم امروہوی نے تقسیم سے پہلے لکھنؤ، رامپور اور میرٹھ میں اپنا زیادہ وقت گزارا اور ہجرت کے بعد پاکستان میں خیر پور اور کراچی میں مقیم رہے۔ نسیم امروہوی جہاں اور جس شہر میں رہے، وہاں کی ادبی روایت کا حصہ بنے۔ میرٹھ میں قیام کے دوران وہ یہاں کے مشہور تعلیمی ادارہ منصبیہ عربی کالج و مدرسہ دارالعلوم میرٹھ میں ادبیات عربی و فارسی کے استاد رہے۔ درس و تدریس کے ساتھ شعر و ادب کے گیسو سنوارنے میں وہ پیش پیش رہتے تھے اور خاص کر رثائی ادب میں ان کے اجتہادات نے نئی نسل کو متوجہ کیا اور قدیم روایتوں کے ساتھ جدید لب ولہجہ کی شعریات کو جنم دیا۔ عظیم امروہوی کے مطابق ۱۹۲۴ء یعنی ۱۵ سال کی عمر سے آپ کی مرثیہ نگاری کا آغاز ہوا۔''[۳۳]

نسیم کے پہلے مرثیے کا بند درج ذیل ہے:

تجھ میں اے باغ وطن اب گل خوش رنگ نہیں — کس روش پر گل و بلبل میں یہاں جنگ نہیں
تن پہ کس غنچے کے ہستی کی قبا تنگ نہیں — طنطنے ہیں وہی ماضی کے وہ اورنگ نہیں

آنکھ باوصف تکدر جدھر اٹھ جاتی ہے
فقر کی شاہی بے ملک نظر آتی ہے

نسیم نے منظر نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کی بہترین مثال پیش کی ہے۔ خوبصورت زبان میں نسیم کے مکالمے کوثر و تسنیم سے دھلی زبان محسوس ہوتے ہیں۔ حضرت حر کے کردار اور مکالمہ نگاری کے ذیل میں انیس کے مراثی جواب نہیں رکھتے لیکن نسیم نے جو حضرت حر اور عمر سعد کا مکالمہ نظم کیا ہے اس کا بھی جواب نہیں ہے۔ حضرت حر عمر سعد سے مخاطب ہیں:

شاہ، زہراؑ کے پسر ہیں کہ نہیں؟ بولا ہیں — نفس احمدؐ کے جگر ہیں کہ نہیں؟ بولا ہیں
وارث خیر بشر ہیں کہ نہیں؟ بولا ہیں — نیک دل پاک نظر ہیں کہ نہیں؟ بولا ہیں

Scanned with CamScanner

تیرے حاکم میں یہ اوصاف ہیں؟ بولا کہ نہیں
رجس سے قلب ونظر پاک ہیں؟ بولا کہ نہیں

شہ نے روزہ کوئی چھوڑا ہے؟ یہ بولا کہ نہیں  منہ کبھی سجدے سے موڑا ہے؟ یہ بولا کہ نہیں
دل کسی شخص کا توڑا ہے؟ یہ بولا کہ نہیں  خون حرمت کا نچوڑا ہے؟ یہ بولا کہ نہیں

تیرے حاکم میں ہیں یہ عیب؟ کہا بیشک ہیں
اور بھی عیب ہیں لاریب؟ کہا بیشک ہیں

اسی طرح نسیم جب اپنے مرثیوں میں کردارنگاری کرتے ہیں تو مدح کا ایسا پہلو نکالتے ہیں کہ قاری یا سامع اس شخصیت سے کماحقہ واقف ہوجائے، ایسی متعدد مثالیں جناب ابوطالبؑ، جناب خدیجہؑ، جناب فاطمہؑ زہرا اور جناب زینبؑ کے کرداروں کے مطالعہ کے وقت محسوس کی جاسکتی ہیں۔ جناب زینبؑ کا کردار جب وہ نظم کرتے ہیں تو مداحی، مداحی نہ رہ کر مدلل فکروعمل کا روپ دھار لیتی ہے۔ صرف ایک بند ملاحظہ کریں:

شریک صبر شہ مشرقین ہیں زینبؑ  کہ عین فاطمہ کی نور عین ہیں زینبؑ
دل محمدؐ و حیدرؑ کا چین ہیں زینبؑ  خدا کی راہ میں بالکل حسینؑ ہیں زینبؑ

حسین مرد رہ انقلاب ہیں گویا
یہ عورتوں میں عمل کی کتاب ہیں گویا

درج بالا بند سے مترشح ہوتا ہے کہ نسیم کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے قدیم وجدید اساتذہ کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ عاشور کاظمی نے انھیں کلاسیکی روایت کا آخری شاعر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''نسیم امروہوی ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، نظم حتیٰ کہ گیت تک انھوں نے سب کچھ لکھا ہے، مگر ان کا اصل میدان شاعری مرثیہ ہے۔ مرثیے میں انھوں نے روایت کی بھرپور پابندی کی ہے۔ وہ ہمارے عہد کے کلاسیکی روایت کے آخری شاعر ہیں، لیکن مرثیے کے مضامین میں انھوں نے نئی راہیں تلاش کی ہیں جس کی بنیاد اور سبب ان کا علمی تبحر ہے۔'' ۳۴

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر ای اے حیدری نے اپنے تحقیقی مقالہ ''ہندوستان میں جدید اردو مرثیہ'' میں نسیم امروہوی پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''مرثیوں میں ترقی پسندانہ رجحانات نسیم امروہوی کی دین ہیں۔ جس کا ثبوت ان کا وہ مرثیہ ہے جو انھوں نے ۱۹۲۳ء میں ترقی پسند تحریک کے آغاز سے تیرہ سال قبل کہا تھا۔ اس مرثیے میں نسیم امروہوی نے اپنے دور کے حالات اور گردوپیش کا جائزہ پیش کرتے ہوئے زمانے کے مسائل ومشکلات کو نہ صرف پیش کیا ہے بلکہ ان کا حل بتا کر قوم کی اصلاح وتربیت کا کام کیا ہے اور مرثیہ کے علمی مزاج کو بلند کرتے ہوئے اسے اس دور کے تقاضوں سے اس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے کہ وہ شاعری رہے تاریخ نہ معلوم ہو۔'' ۳۵؎

اس سلسلے میں ڈاکٹر ای اے حیدری نے متعدد بند بطور مثال پیش کیے ہیں، لیکن مضمون کی طوالت کے خوف سے صرف ایک بند پر اکتفا کیا جا رہا ہے:

تھرتھراتے ہیں قدامت کے فلک بوس محل گھر کے آتے ہیں تجدد کے بھیانک بادل
سنبھل اے رہ روِ گم گشتۂ ایام سنبھل ہر قدم اک نئی آفت ہے ذرا دیکھ کے چل
چھپ کے بیٹھا ہے تری گھات میں دشمن تیرا
کہیں کانٹوں میں الجھ جائے نہ دامن تیرا

بہرحال نسیم امروہوی کے مراثی اپنے موضوعات کے تنوع کے سبب قدیم وجدید مراثی کا ایک حسین سنگم ہیں۔

نسیم امروہوی کے علاوہ میرٹھ سے تعلق رکھنے والے جن شعرا نے پاکستان ہجرت کی اور انھوں نے مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا، ان میں مسعود فضا خاکی، ڈاکٹر صفدر حسین، امید فاضلی، شاہد نقوی اور شہاب کاظمی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ جن کا تذکرہ عاشور کاظمی، ای اے حیدری، طاہر حسین کاظمی اور ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنی تالیفات میں خصوصیت سے کیا ہے۔ اس لیے مضمون کی طوالت کے پیش نظر ان کی مرثیہ نگاری کا تذکرہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ یہاں پر انھیں شعرا کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو گمنامی کا شکار ہو رہے ہیں یا جنھیں تذکرہ نگاروں نے مناسب جگہ نہیں دی۔

Scanned with CamScanner

**ریاضؔ، ریاض الدین حسن:**

سید ریاض الدین حسن نام اور تخلص ریاضؔ تھا۔ موانہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ آپ کا تعلق سادات بارہہ تھا۔ آپ کے والد سید جلال الدین حیدر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں کوتوال اور اپنے علاقے کے نامور رئیس تھے۔ ریاض ۱۸۷۲ء میں محکمۂ سپلائی میں گماشتہ کی حیثیت سے سیتاپور میں مقیم تھے۔ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں میر انیسؔ کے شاگرد تھے۔ مرزا امیر علی بیگ جونپوری کے مطابق ''ریاضؔ نہایت زود گو اور قادرالکلام شاعر تھے۔ غدر کے بعد وطن واپس چلے گئے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں انتقال کیا اور اپنے آبائی وطن موانہ میں دفن ہوئے۔'' بطور مثال مرثیے کے چند بند دیکھیں جس میں اپنی شعریات کی فنی عظمت کے ساتھ خانوادۂ انیسؔ کا بھی گن گان کیا ہے جو ان کی عقیدت کا مظہر ہے:

جوہر تیغ سخن ذہن رسا ہے میرا　　حامی و مرتبہ داں سیف خدا ہے میرا
داغ سے پاک مہ نظم ثنا ہے میرا　　وہ رقم ہے کہ عطارد بھی گدا ہے میرا
خلد ہے جس کا صلا یہ وہ ثناخوانی ہے
نظم اول ہے فصاحت میں یہ لاثانی ہے

ان سے رکھتا ہوں عقیدہ کہ جو ہیں نظم کے شاہ　　دھوم کونین میں ہے جن کے سخن کی واللہ
نکتہ داں فیض رسا شاعر باعزت وجاہ　　نظم پر جن کی فصاحت بھی بلاغت بھی گواہ
تاج سرجن کو فصیحان جہاں مانتے ہیں
خاص بھی عام بھی عالم بھی انھیں جانتے ہیں[۳۶]

**سید، سید احمد میرٹھی:**

ممتاز بزرگ مرثیہ گو شاعر حضرت سید احمد سید میرٹھ کی شعری محفلوں کی جان تھے۔ آپ ۲۸/جون ۱۸۹۸ء کو شہر میرٹھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵/اپریل ۱۹۷۶ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ پہلا مرثیہ ۱۹۱۹ء یعنی صرف اکیس سال کی عمر میں کہا۔ کاظم میرٹھی کے شاگرد تھے۔ مختلف شعری اصناف غزل، قصیدہ، رباعیات اور سلام میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ مرثیوں کی مجلس میں ضرور شرکت کرتے تھے۔ آپ نے تقریباً چوبیس مرثیے کہے، تحت اللفظ خوانی کے فن میں ماہر تھے۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد کراچی کے چند مجلسوں میں بھی مرثیے پڑھے۔

نور احمد نور میرٹھی نے درج بالا اطلاع کے ساتھ قصیدہ کے چند اشعار پیش کیے ہیں لیکن

Scanned with CamScanner

مراثی کا کوئی نمونہ نہیں پیش کیا ہے۔

**صفیر، شیخ کرامت حسین:**

شیخ کرامت حسین ۱۸۸۴ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ سجاد حسین عشیر کا شمار اچھے شعرا میں ہوتا تھا، جن کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے۔ آپ کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ شاعری کی ابتدا نوحہ وسلام سے ہوئی۔ چالیس سال کی عمر سے مرثیہ کہنا شروع کیا۔ مرثیہ میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ آخر عمر تک مرثیہ گوئی شغف رہا۔ آپ کے مرثیوں کی زبان صاف اور پر اثر ہے۔ ۵۴ سال کی عمر میں ۱۹۳۸ء میں انتقال کیا۔ ۳۷

رسوا میرٹھی ان کے شاگرد تھے اور استاد وشاگرد میں بعد میں چشمک بھی رہی، مثال کے دو بند دیکھیں۔ جو استاد کی شاگردی سے ناراضگی کو ظاہر کرتے ہیں:

جب لطف شاعری ہے کہ ذہن رسا بھی ہو　　واقف عروض سے ہو کسی سے پڑھا بھی ہو
کچھ علم فارسی بھی ہو، فہم وذکا بھی ہو　　لازم ہے صرف ونحو کو وہ جانتا بھی ہو
تحصیل علم کے لیے آگے بڑھے نہیں
بغدادی قاعدے سے آگے پڑھے نہیں

کہنا یہ مرثیہ کا تو آساں سمجھتے ہیں　　اس نظم کو یہ نثر پریشاں سمجھتے ہیں
کج فہم اپنے آپ کو ذی شاں سمجھتے ہیں　　ان کی سمجھ کو خوب سخنداں سمجھتے ہیں
ہے آرزو شغال کے دل میں شکار کی
گھسیارہ ہمسری کرے دلدل سوار کی

نور احمد نور میرٹھی نے تذکرہ شعرائے اردو میرٹھ میں فاطمہ زیدی فاطمہ جیسی شاعرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی سادہ گوئی ومرثیہ نگاری کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے کلام کا کوئی نمونہ پیش نہیں کیا ہے۔ اس طرح میرٹھ کی شاعرات کے ذکر سے یہ مضمون خالی ہے، جبکہ یہاں رثائی ادب کی خدمت کرنے والی شاعرات بھی ضرور ہوں گی جس تک راقم الحروف کی رسائی نہ ہو سکی۔

**ریحان، مولانا سید محمد:**

نور احمد نور میرٹھی کے مطابق: ''مولانا سید محمد صاحب منصبیہ عربک کالج میرٹھ میں پروفیسر رہے ہیں۔ آپ کا شمار اساتذہ فن میں ہوتا ہے۔'' نمونہ کلام میں انھوں نے قصیدہ کے

Scanned with CamScanner

صرف تین شعر پیش کیے ہیں، جبکہ وہ ایک کامیاب مرثیہ گو تھے۔ میرٹھ میں بہت سے شعرا ان کے شاگرد تھے۔ جن میں انور اظہیر انورؔ میرٹھی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔''

عظیم امروہوی ان کی مرثیہ نگاری کی ابتدا کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''مرثیہ نگاری کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ آپ نے ۳۱/اگست ۱۹۴۵ء کو ایک خواب دیکھا جس میں مدح اہل بیت کا حکم ہوا۔ اس کے بعد آپ نے مرثیہ کہا۔ اب تک آپ نے تقریباً ۱۰ مرثیے کہے ہیں۔''۳۸

شاعری میں غزلیں، قصائد، قطعات، نوحے، سلام، رباعیات اور مراثی یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کے استاد سید اظفر حسین منتظرؔ امروہوی تھے۔ ان کی وفات کے بعد سید احمد سیدؔ میرٹھی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔

عظیمؔ امروہوی نے درج ذیل مرثیوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ مرثیے ان کی نظر سے گزرے ہیں۔

ع- معراج زندگی کی نشانی ہے کربلا
ع-مخبر ذبح عظیم، اے ماہ پرغم کے ہلال
ع-زینبؑ فضیلتوں کے سمندر کا نام ہے
ع-قرآن سر کٹاکے سنایا حسینؑ نے
ع-احساس کے فلک کا ستارا حسینؑ ہے
ع-چاہے کوئی عالم ہومگر عزم جواں ہو

درج بالا مراثی کے حوالے سے عظیمؔ امروہوی نے لکھا ہے کہ:

''ریحانؔ نے قوم وملت کی بیداری، اصلاح قوم، آزادی، انقلاب اور عمل پر زور دیا ہے۔ ان مراثی میں ساقی نامہ، رخصت، رجز، تلوار اور گھوڑے کی تعریف، سراپا اور شہادت وغیرہ کا بیان کیا ہے۔''۳۹

ایک مرثیہ کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں جس میں ان کے انفرادی رنگ وآہنگ کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

معراج زندگی کی نشانی ہے کربلا  حق جس میں ہے جواں وہ جوانی ہے کربلا

Scanned with CamScanner

دریائے فیض شاہ کا پانی ہے کربلا اب بھی بہار نور فشانی ہے کربلا
سو عظمتوں کا منبر اسلام کربلا
اسلام کے وطن کا ہے اک نام کربلا

ریحانؔ اپنے مراثی میں مقصد حسینؑ کی وکالت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

مائل ذوق جہانگیری اگر ہوتے حسینؑ ہر جگہ اپنے ہی مقصد کے نگر ہوتے حسینؑ
پیاسے اعدا پر نہ مثل ابر تر ہوتے حسینؑ مہرباں ہرگز نہ حر کی فوج پر ہوتے حسینؑ
راہ میں ہی حر کے لشکر کو پلاتے آب تیغ
سجدہ کرتا ہر سپاہی دیکھ کر محراب تیغ

میرٹھ کی مشہور ادیبہ و ذاکرہ ڈاکٹر عفت ذکیہ نے ان کے صاحبزادے سے بار بار تقاضا کیا لیکن انھوں نے ریحانؔ کے مرثیوں کی زیارت نہیں کرائی، جس کے سبب عظیم امروہوی اور عاشور کاظمی کی تحریروں سے استفادہ کرتے ہوئے ریحانؔ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ریحانؔ کے شاگرد انور ظہیر انورؔ میرٹھی کے مطابق ریحانؔ کے مرثیوں پر جوش کے اثرات کا پرتو جھلکتا ہے، لیکن ریحانؔ نے انقلابی لے کی جگہ مقصدی شاعری کو اپنے مراثی میں جگہ دی ہے۔ عاشور کاظمی نے اعتراف کیا ہے کہ ریحان کے پاس جدید مرثیے کا پیغام پہنچ گیا تھا اور وہ اس کا اظہار بھی کرتے تھے لیکن وہ مرثیے میں ہیئت میں تبدیلی کے حق میں نہیں تھے۔[۴۰]

ریحانؔ کا مرثیہ ع۔ ''مخبر ذبح عظیم اے ماہ پر غم کے ہلال'' کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں جس میں کلاسیکی اقدار کے تحفظ کے ساتھ جدید مرثیے کا اسلوب بھی دکھائی دیتا ہے:

اے مہ غم اے شہید کربلا کے سوگوار اے مفکر کی طرح کاہیدہ و غمگین وزار
باد گردوں پر تجھے میں نے جو دیکھا جلوہ بار یاد آئی مجھ کو اطفال حسینی کی قطار
غنچۂ زخم دل بیتاب اک دم کھل گیا
کوزۂ دستِ سکینہ کی طرح دل ہل گیا

درج بالا مرثیے کا ذکر ہلال نقوی نے اپنی تصنیف ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ''[۴۱] میں کیا ہے۔ ہلال نقوی نے کاظم علی میرٹھی[۴۲] کے ایک مرثیہ ع۔ سید کے بھی کلام میں ہے حسن کی ادا، کا بھی ذکر کیا ہے جس کے چہرے میں کاظمؔ نے اپنے کلام کی شاعرانہ انفرادیت کا محاکمہ کیا ہے۔ ہلال نقوی نے اپنی تصنیف میں کاظمؔ اور ریحان کے علاوہ درج ذیل شعرا کے

ان مرثیوں کا ذکر کیا ہے:

ع - مداحوں میں حسین کے رسوا ہیں نامور (رسواؔ میرٹھی)

ع - اشعار میں رواں کے روانی کو دیکھیے (رواںؔ میرٹھی)

ع - تخلیق میں نمونۂ قدرت ہیں فاطمہ (سروشؔ مچھلی شہری میرٹھی)

لیکن درج بالا مراثی تک راقم کی رسائی نہیں ہوسکی۔ لیکن یہ مرثیے ہلال نقوی کے مطالعے میں آئے تھے۔ اس لیے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہلال نقوی نے رواںؔ میرٹھی کے مرثیہ ''حسین کا آخری دبدبہ'' اور ''صغیر مجاہد'' کا بھی ذکر کیا ہے جو علی الترتیب خورشید پریس میرٹھ سے ۱۹۳۲ء و ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔

**انور ظہیر انورؔ میرٹھی:**

موجودہ عہد میں میرٹھ میں مرثیہ کی آبرو استاد انور ظہیر انورؔ میرٹھی ہیں۔ ان کے والد منشی عظمت حسین میرٹھ کے مشہور تحت اللفظ خوانوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ انورؔ میرٹھی جہاں خوش فکر شاعر ہیں وہیں ایک اچھے تحت اللفظ خوان بھی ہیں۔ انور ظہیر میرٹھی نے ۱۳۷۲ھ میں میرٹھ کے رئیس ونواب حاجی منصب علی خاں کے برادر حقیقی ولایت علی کے گھر پیدا ہوئے۔ ولایت علی حاجی منصب علی خان کے برادر حقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ انور ظہیر انورؔ کے حقیقی پردادا ہیں۔ اس طرح انور میرٹھی میرٹھ کے ایک علم دوست خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔ حاجی منصب علی خاں کا قائم کردہ ادارہ منصبیہ عربی کالج میرٹھ اس شہر کی علمی وراثت کا امین بن کر اج بھی تشنگان علوم دین و دنیا کو سیراب کر رہا ہے۔ اسی ادارے میں انور ظہیر میرٹھی کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ بعدہٗ سینٹ تھامس پرائمری اسکول سے پرائمری کے امتحانات پاس کیے اور فیض عام انٹر کالج میرٹھ سے ہائی اسکول اور میرٹھ منصبیہ کالج کے سینٹر سے ادیب کامل و معلم اردو کے امتحانات جامعہ اردو علی گڑھ سے پاس کیے۔ منصبیہ کالج میرٹھ کے استاد مولوی ریحان امروہوی سے شاعری کے رموز سیکھے اور ان کے باقاعدہ شاگرد ہوئے۔ مختلف اصناف سخن غزل، نظم، رباعی، قطعہ، نعت و منقبت، سلام، قصیدہ اور مرثیہ پر طبع آزمائی کی۔ اب تک چھ مرثیے بعنوان علم، آنکھیں، زبان، صبر و شجاعت، شریکۃ الزینبؑ (جناب ام کلثومؑ) اور مسلم ابن عقیل کہہ چکے ہیں۔ ان کے مرثیے روایت اور جدت کا حسین سنگم ہیں۔ پیغام رسانی ان کے مراثی کا بنیادی مقصد ہے اور تاریخ میں محتاط روی ان کے مرثیوں کو انفرادی رنگ عطا کرتی

Scanned with CamScanner

ہے۔ مروجہ موضوعات سے ہٹ کر مراثی کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرثیہ خوانی کے احیاء کے لیے فکرمند رہتے ہیں اور نئی نسل کو تحت اللفظ اور مرثیہ خوانی کے ساتھ مرثیہ گوئی کی طرف مائل کرتے رہتے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد تو کافی ہے لیکن فخری جعفری نے نوحہ وسلام کے ساتھ مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا ہے۔

انور ظہیر میرٹھی کے چار مرثیے میرے مطالعے میں آئے ہیں، جن کے مطلعے درج ذیل ہیں:

ع۔ اے خضر کاروان سخن راستہ دکھا (در مدح شریکۃ الزینبؑ جناب ام کلثومؑ)

ع۔ شریک نور رسالت مآب ہیں سجاد (در مدح امام زین العابدین)

ع۔ رونق منبر محبوب الٰہی ہے علم (علم کی تاریخی اہمیت اور جناب عباسؑ کے فضائل ومناقب)

ع۔ صدف پیکر انسان کا پیکر ہے زباں (زبان کی اہمیت اور اس کی مختلف کیفیات اور مصائب حضرت علی اصغرؑ)

مضمون کی طوالت کے پیش نظر اس جگہ آخر الذکر مرثیہ زبان کی اہمیت اور اس کے فنی تقاضوں کی پیش کش کو یہاں پیش کیا جارہا ہے تاکہ قاری انور ظہیر میرٹھی کی استادانہ مہارت اور ان کی لفظیات کے دروبست سے کماحقہ واقف ہوجائیں۔ مرثیہ کا مطلع ہی انور ظہیر میرٹھی کی مرثیہ پر گرفت پر دال ہے:

صدف پیکر انسان کا پیکر ہے زباں آدمی کے لیے اک رحمت داور ہے زباں
ہونٹ دربان ہیں اور دانتوں کے اندر ہے زباں لفظ تو ہے یہ مونث پہ مذکر ہے زباں
بولتی ہے یہ مگر لفظ بشر کہتا ہے
مرد وہ ہے جو صدا ایک زباں بولتا ہے

انور ظہیر انور میرٹھی اپنے مراثی سے پیغام رسانی کا کام لیتے ہیں۔ اصلاح زبان کے ساتھ اصلاح قوم کا بھی کام بھی مرثیہ ہی کے ذریعہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مرثیہ کی عظمت کے قائل ہیں ان کا خیال ہے کہ مرثیے کو سمجھنے کے لیے دل کی زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔

عبد ومعبود کے مابین ذریعہ ہے زباں ذکر وحدت کے لیے ایک وسیلہ ہے زباں
آل کا ذکر ہے جس پر وہ مدینہ ہے زباں مرثیہ کہنے کو شبیرؑ کا صدقہ ہے زباں
مرثیہ کھیل نہیں خوں سے لکھا جاتا ہے
صرف کانوں سے نہیں دل سے سنا جاتا ہے

Scanned with CamScanner

ذاکر سبط نبیؐ جب بھی زباں کھولتا ہے ہے سخن کس کا یہ خود رنگ سخن بولتا ہے
میرؔ و مرزاؔ کا ہنر کانوں میں رس گھولتا ہے اور سامع بھی ہر اک وزن سخن تولتا ہے

صاحب فہم ہی اس بات کو پہچانتے ہیں
ہے زباں کس کی یہ سب اہل زباں جانتے ہیں

شاعر مرثیہ میں انیسؔ و دبیرؔ کی عظمت کا قائل ہے اور اس فن کے لیے لفظیات اور اس کے برمحل استعمال کو ضروری سمجھتے ہیں۔ انورؔ میرٹھی اپنے مرثیوں میں مرثیہ کے جملہ لوازم کا بھرپور خیال رکھتے ہیں۔ وہ مکالمہ نگاری میں استادانہ مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔ بطور مثال ان کے مرثیہ ''زبان'' سے حضرت علی اصغر اور امام حسینؑ کا مکالمہ ملاحظہ فرمائیں جو ان کے اجتہادی رنگ کا خوبصورت بیانیہ بھی ہے:

عرض کہ شہ سے کہ پوتا اسداللہ کا ہوں جنگ کرنی ہے مسافر میں اسی راہ کا ہوں
دشمن کفر ہوں حالانکہ میں چھ ماہ کا ہوں اتنا کافی ہے اخی اکبرؑ ذی جاہ کا ہوں

چچا عباسؑ نے ہاتھوں میں جھلایا ہے مجھے
شیر مادر نے وضو کر کے پلایا ہے مجھے

کہا شبیرؑ نے شاباش مرے گل اندام تم سے کیا جنگ کریں گے یہ بھلا بدانجام
اک اشارے کا ہے محتاج فقط لشکر شام تم اگر چاہو زباں سے ہی کرو کام تمام

رکھ دو ہونٹوں پہ زباں نام بھی ہو جائے گا
بات رہ جائے گی اور کام بھی ہو جائے گا

**فخریؔ جعفری میرٹھی:**

انورؔ ظہیر میرٹھی کے شاگردوں میں فخریؔ جعفری میرٹھی پوری دنیا میں مشاعروں، مقاصدوں اور محافل کے ذریعہ میرٹھ کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ غزل، منقبت، نوحہ، سلام، قطعہ، رباعی اور مراثی میں طبع آزمائی کر کے میرٹھ کی شان بنے ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر استاد ہیں لیکن منصبیہ عربی کالج کے متولی و منتظم بننے کے بعد اپنی تنظیمی صلاحیت سے اس قدیم ادارے کو از سر نو زندگی عطا کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ منصبیہ کا شاندار علمی و ادبی ذخیرہ جس کے لیے کوئی بلڈنگ نہیں تھی اور بڑی کربلا کی شہ نشینوں میں یہ علمی ذخیرہ لائبریری کی شکل میں کام کر رہی تھی۔ ایک نئی عمارت کی تعمیر کرا کے اس علمی وراثت یعنی نایاب کتابوں کو محفوظ

Scanned with CamScanner

کرنے کا کام کیا۔ میرٹھ کی بڑھتی ہوئی آبادی اور مختصر ہوتے مکانات کے سبب میت کو غسل دینا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ فخری جعفری اور ان کی ٹیم نے منصبیہ عربی کالج میں ایک غسل خانہ قائم کیا تاکہ مومنین اپنے مرحومین کی صحیح طریقے سے تجہیز و تکفین کر سکیں۔ موجودہ عہد کی ضرورت کے تحت اس غسل خانے میں ایئر کنڈیشن تابوت کا بھی انتظام کیا گیا ہے تاکہ گرمیوں میں میت محفوظ رہے اور وقت پر اس کی تدفین عمل میں لائی جا سکے۔

فخری جعفری نے مکمل مرثیے تو نہیں کہے ہیں لیکن دو مرثیے (۱) پیاس (۲) اذان کے عنوان سے کہہ رہے ہیں۔ حضرت علیؑ اصغر کا مثالی کردار اور ان کا فلسفۂ شہادت فخری جعفری کا پسندیدہ موضوع ہے۔ انھوں نے نوحہ اور سلام میں اس موضوع کو انفرادی رنگ عطا کیا ہے۔ اس موضوع کو انھوں نے مرثیے کے لیے بھی چنا اور اذان کا عنوان بنا کر مرثیہ کہہ رہے ہیں۔ صرف ایک بند ملاحظہ فرمائیں اور فخریؔ کے انفرادی آہنگ کو محسوس کریں:

لرز رہے تھے زمیں اور آسماں رن میں — وہ بھوک پیاس کی شدت وہ بے زباں رن میں
دیا حسینؑ کے ہاتھوں پہ امتحان رن میں — نماز عشق کی اصغرؔ نے دی اذاں رن میں
ہوا شہید وہ شاہ حجاز سے پہلے
اذان ہوتی ہے جیسے نماز سے پہلے

پیاس واقعہ کربلا کی ایک ایسی حقیقت ہے جس نے ساری دنیا کے انسانیت پسند لوگوں کو سوچنے پر مجبور کیا کہ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے نواسۂ رسول کو بھوکا اور پیاسا شہید کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مرثیہ نگاروں نے پیاس کو موضوع بنا کر متعدد مرثیے کہے ہیں۔ فخریؔ جعفری نے بھی پیاس کو موضوع بنایا ہے لیکن اس پیاس میں سقائے حرم حضرت ابوالفضل العباس کی وفاداری کی کہانی شامل ہے۔ بطور مثال دو بند ملاحظہ فرمائیں اور فخری کے قابل فخر تخیلات کی داد دیں:

نکلا تھا وعدہ کر کے جو ننھی سی جان سے — دریا پہ پہنچا مشک بھری اپنی شان سے
پیاسا پلٹ کے آ گیا کس آن بان سے — حیرت سے دیکھتے تھے ملک آسمان سے
پیاسے نے جب دکھا دیا دریا دلی کے ہاتھ
کوثر نے خود کو بیچ دیا تشنگی کے ہاتھ
تیغوں سے جرأتوں کا وہ دریا نہیں رکا — سیراب ساری فوج تھی پیاسا نہیں رکا

Scanned with CamScanner

لاکھوں کی فوج سے وہ اکیلا نہیں رکا کوشش تو کی یزیدوں نے روکا نہیں رکا
تھا اس کا عزم آہنی دیوار کی طرح
ثابت قدم تھا عابد بیمار کی طرح

درج بالا سطور میں فرقانی سے لے کر فخری جعفری تک کے مرثیوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا گیا جس سے واضح ہوتا ہے کہ میرٹھ میں انیس و دبیر سے لے کر موجودہ عہد تک رثائی ادب خصوصاً مرثیہ کے میدان میں شعرائے میرٹھ نے اپنی طباعی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے اپنے رثائی آہنگ اور حزنیہ اسلوب سے میرٹھ کی ادبی روایت کو مستحکم کیا اور بتایا کہ سرزمین میرٹھ کا رثائی مواد کسی عہد میں بھی کمتر نہیں رہا بلکہ اپنے اجتہادات سے اپنی برتری اور عظمت کو تسلیم کرایا ہے۔

☆☆☆

**حواشی:**

(۱) کلیات نظم حالی (جلد اول) حالی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۸ء، ص:۶۴۱
(۲) بحوالہ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، ہلال نقوی، کراچی ۱۹۹۴ء، ص:۹۷
(۳) اردو مرثیہ میر انیس کے بعد، سید طاہر حسین کاظمی، ایرانین آرٹ پرنٹرز، دہلی ۱۹۹۷ء، ص:ب
(۴) اردو مرثیے کا ارتقا، مسیح الزماں، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۲ء، ص:۹۶
(۵) کربل کتھا، مرتبہ مالک رام و مختار الدین احمد (ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ) بحوالہ اردو مرثیے کا ارتقا، ص:۹۶
(۶) اردو مرثیے کا ارتقا، مسیح الزماں، ص:۹۸-۹۷
(۷) مضمون کربل کتھا کا لسانی تجزیہ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مشمولہ سہ ماہی اردو شمارہ اپریل ۱۹۶۸ء، ص:۳۸
(۸) بیسویں صدی ارجدید مرثیہ، ہلال نقوی، کراچی ۱۹۹۴ء، ص:۴۲-۴۱
(۹) غالب کے ایک ہم عصر (سید احمد حسن فرقانی وشا کی مشمولہ فکر و ریاض، علی جواد زیدی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۷۵ء، ص:۱۶۳
(۱۰) میر انیس نادر معلومات، سید علی احمد دانش، بحوالہ اردو میں شخصی مرثیے کی روایت،

Scanned with CamScanner

عابد حسین حیدری، ایم آر پبلی کیشنز، دہلی ۲۰۰۸ء، ص: ۱۴۲-۱۴۱
(۱۱) قندیل حرم، مرتبہ ڈاکٹر صفدر حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص: ۵
(۱۲) بیان میرٹھی: حیات اور شاعری، محمد شرف الدین ساحل، ناگپور، ۱۹۸۰ء، ص: ۱۸
(۱۳) ایضاً، ص: ۱۹۰
(۱۴) بیان میرٹھی حیات و شاعری، محمد شرف الدین ساحل، ص: ۱۸۲
(۱۵) ایضاً، ص: ۱۷۸
(۱۶) دبستان دبیر، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی، الواعظ صفدر پریس لکھنؤ، ۱۹۶۶ء، ص: ۳۷۲
(۱۷) راجستھان میں رثائی ادب کا ارتقاء، ڈاکٹر نصرت فاطمہ، اپلائڈ بکس نئی دہلی، ۲۰۱۶ء، ص: ۳۲۸
(۱۸) تذکرہ شعرائے میرٹھ، نور احمد میرٹھی، ادارۂ فکر نو، کراچی ۲۰۰۳ء، ص: ۴۴۵
(۱۹) تذکرہ شعرائے اتر پردیش، تیرہویں جلد، عرفان عباسی، ص: ۸۰-۷۷ و تذکرہ شعرائے میرٹھ، نور احمد میرٹھی، ادارۂ فکر نو، کراچی ۲۰۰۳ء، ص: ۴۴۶
(۲۰) تذکرہ شعرائے میرٹھ، نور احمد میرٹھی، ادارۂ فکر نو، کراچی ۲۰۰۳ء، ص: ۴۵۶-۴۵۵
(۲۱) راجستھان میں رثائی ادب کا ارتقا، ڈاکٹر نصرت فاطمہ، ص: ۳۱۶
(۲۲) ایضاً
(۲۳) راجستھان میں اردو زبان و ادب کے لیے غیر مسلم حضرات کی خدمات، ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی، ص: ۲۵۸، بحوالہ راجستھان میں رثائی ادب کا ارتقا، ڈاکٹر نصرت فاطمہ، ص: ۳۱۶
(۲۴) بوستان عقیدت، نور احمد نور میرٹھی، ادارہ فکر نو کراچی، ۲۰۰۷ء، ص: ۴۲۲-۴۲۱
(۲۵) تاریخ ادب اردو، جلد چہارم، جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۹ء، ص: ۴۷۹
(۲۶) ایضاً ص،: ۴۸۴
(۲۷) اردو مرثیہ میر انیس کے بعد، طاہر حسین کاظمی، ۱۹۹۷ء، ص: ۲۰۷
(۲۸) کلیات فائق، مرتب کلب علی فائق، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء
(۲۹) مرثیہ نگاران اردو، جلد دوم، ص: ۱۲۵-۱۲۴ و تذکرہ شعرائے میرٹھ، نور احمد نور میرٹھی، ص: ۱۴۸-۱۴۷

Scanned with CamScanner

(۳۰) تذکرہ شعرائے میرٹھ، نوراحمد نورمیرٹھی، ص:۴۳۱
(۳۱) اردو مرثیہ انیس کے بعد، طاہر حسین کاظمی، ص:۲۲۳
(۳۲) ایضاً، ص:۲۲۷
(۳۳) مرثیہ نگاران امروہہ، عظیم امروہوی، کراچی ۱۹۸۴ء، ص:۵۰۱
(۳۴) اردو مرثیے کا سفر اور بیسویں صدی کے اردو مرثیہ نگار، عاشور کاظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص:۴۹۵
(۳۵) ہندوستان میں جدید اردو مرثیہ کا ارتقا، ڈاکٹر ای اے حیدری، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲۰۱۰ء، ص:۱۴۲
(۳۶) مرثیہ نگاران اردو، ص:۲۶۲-۲۶۱، و تذکرہ شعرائے میرٹھ، نوراحمد نورمیرٹھی، ۵۳۴-۵۳۳
(۳۷) مرثیہ نگاران اردو بحوالہ تذکرہ شعرائے میرٹھ، نوراحمد نورمیرٹھی، ص:۶۸۰
(۳۸) مرثیہ نگاران امروہہ، عظیم امروہوی، ص:۵۸۰
(۳۹) ایضاً، ص:۵۸۱
(۴۰) اردو مرثیے کا سفر بیسویں صدی کے مرثیہ نگار، عاشور کاظمی، ص:۶۳۸
(۴۱) بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، ہلال نقوی، ص:۳۶۷
(۴۲) ایضاً، ص:۳۵۰

☆☆☆

Scanned with CamScanner